دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اپریل تا جون 2010ء • ربیع الثانی تا جمادی الاخریٰ ۱۴۳۱ھ • شمارہ نمبر 2 • جلد نمبر 2 • رجسٹرڈ نمبر S -370

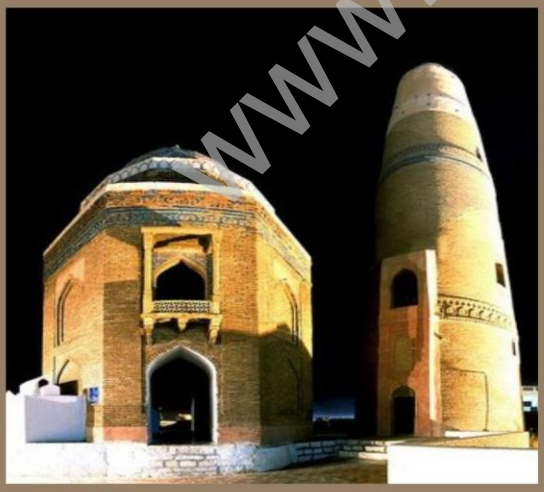

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

فلسفہ شرعیہ کی تدوین اور اصولِ انقلاب

حکیم الہند، حضرت الامام، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، محمد شاہ کے زمانے سے لے کر احمد شاہ (ابدالی) افغانی کے آخری عہد تک ہندوستانیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا بخوبی مشاہدہ کر رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں آپ سیاسی انقلاب کی روح اور اس کے تقاضے پر متنبہ ہوئے۔ اور انھوں نے اس نقطۂ نظر سے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' وغیرہ میں فلسفۂ شرعیہ کی تدوین و ترتیب کی۔ اور لوگوں کو اپنے افکار کی اتباع کرنے کی دعوت دی۔ اور اس بات کی تصریح کی کہ وہ اس دور کے امام ہیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ زمین ایک بہت بڑے انقلاب کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ لیکن اُس زمانے کے اہل حل و عقد اس طرف متوجہ نہیں ہو رہے۔ اور انھوں نے عزت و مرتبت کی طرف واپس لوٹنے کے جتنے بھی امکانات تھے، انھیں گنوا دیا۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں جب اپنا نظریۂ انقلاب تحریر کرتے ہوئے فرمایا:

''وما تراہ من ملوک بلادک یغنیک عن حکایاتھم (أی قیصر و کسریٰ).''

''وہ جو تم اپنے علاقے کے بادشاہوں کی عیاشیوں کو دیکھتے ہو تو یہ تمھیں قیصر و کسریٰ کے واقعات سے مستغنی کر دیں گی۔''

اس جملے میں اس بات کا اشارہ تھا کہ یہ لوگ بھی انقلاب کے مستحق ہیں، جیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کے خلاف انقلاب برپا کرنا ضروری تھا۔ پھر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب **''تفھیماتِ إلٰھیہ''** میں ہندوستانی سوسائٹی کی ہر ہر جماعت کی خرابیوں کو بیان کیا اور انھیں اس کے انجام سے ڈرایا۔

اس کے بعد قریب زمانے میں ہی یورپ کی اقوام مسلح ہو گئیں۔ اور ہندوستان آ پہنچیں۔ انھوں نے ان اصولوں کو اپنے پیش نظر رکھا، جنھیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انقلاب کے لیے تحریر کیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے ہندوستان پر غلبہ پا لیا۔ اور یہ اُن لوگوں کی سزا ہوتی ہے، جو سچائی سے اعراض کرتے ہیں اور حق سے روگردانی کرتے ہیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (۵۹:۱۰) (اے ہمارے پروردگار! ہمیں معاف فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی معاف فرما، جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے۔)

(سرگزشتِ حیات امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ص46)

www.rahimia.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اپریل تا جون 2010ء / ربیع الثانی تا جمادی الاخریٰ ۱۴۳۱ھ | شمارہ نمبر 2 جلد نمبر 2 | رجسٹرڈ نمبر S-370

زیر سرپرستی
حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ

مجلس ادارت

صدرِ مجلس	مدیر اعلیٰ	مدیر
پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن	مفتی عبدالخالق آزاد	محمد عباس شاد

مشاورت

مفتی عبدالمتین نعمانی	پرے والا	پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب
مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی	کراچی
مفتی عبدالغنی قاسمی	لاہور	پروفیسر حسین احمد علوی	چشتیاں
مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور
سید سیف الاسلام خالد	راولپنڈی	پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	پروفیسر محمد سعید اختر	اسلام آباد
مولانا محمد ناصر	جھنگ	پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

قیمت فی شمارہ: 100 روپے
سالانہ زرِتعاون: 350 روپے

شعبہ مطبوعات
ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
Ph:0092-42-36307714 / 36369089 , Web:www.rahimia.org

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع وناشر نے اے۔ بے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ، لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ "شعور و آگہی"، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

اس شمارے میں

اداریہ:	حرفِ اول	مدیر اعلیٰ	3
شخصیات:	سرگزشتِ حیات (2) امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ	ترجمہ وتحقیق: مفتی عبدالخالق آزاد☆	5
تحریکاتِ آزادی:	ایشیا کی عہد ساز قیادت (1) شیخ الہندؒ اور تحریک آزادی	مولانا محمد ناصر☆	55
تبصرۂ کتب:		محمد عباس شاد☆	101
آراء و تأثرات:	گرامی نامہ و تبصرہ		116
خوش خبری:	ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) کی ترقیات		120

تعارف مقالہ نگار

☆ **مفتی عبدالخالق آزاد**

ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

☆ **مولانا محمد ناصر**

لیکچرار شعبہ علومِ اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، جھنگ

☆ **محمد عباس شاد**

مدیر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی'' لاہور

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اول

دین اسلام کی تعلیمات اپنے اندر جامعیت لیے ہوئے ہیں۔ ان میں جہاں عقائد و افکار کی درستگی اور فلسفہ و فکر کی بالیدگی کے لیے رہنمائی موجود ہے، وہاں انسانی زندگی کے عملی سیاسی اور معاشی نظام سے متعلق تعلیمات بھی موجود ہیں۔ سیاسیات دین اسلام کی تعلیمات کا ایسا اہم شعبہ ہے کہ جس کے بغیر دین کا عملی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کی سیاست کرتے رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء'' (بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیا کرتے تھے۔) (رواہ البخاری) اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ انبیاؑ کی بعثت کے مقاصد و اہداف میں ایک اہم ہدف قوموں کی سیاست ہے۔ اس پس منظر میں ہی خلفائے راشدین کی سیاسی جدوجہد اور ان کا حکومتی کردار ادا کرنا رہا ہے۔

علمائے ربانیین چوں کہ انبیا علیہم السلام کے حقیقی وارثین اور جانشین ہوتے ہیں، اس لیے مجددین اولیاء اللہ اور علمائے ربانیین نے جہاں دین کے دیگر شعبوں میں انسانیت کی رہنمائی کی ہے، وہاں انھوں نے سیاسیات کے میدان میں بھی اپنی اپنی اقوام کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ یہ علومِ نبوت کی وراثت کا اثر ہے کہ انھوں نے سیاست کے میدان کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد اور کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کے غلبے کے زمانے میں مجددین اولیاء اللہ، خاص طور پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ، حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے سلسلے کے علمائے ربانیین نے اپنے اپنے دور کے حکمرانوں کی سیاست کو درست راستے پر رکھنے کے لیے رہنمائی فرمائی۔ اور اس کے لیے آوازۂ حق بلند کیا۔ اور یوں شریعت، طریقت اور سیاست کی جامعیت کی اساس پر دین اسلام کی تعلیمات کے فروغ اور اس کی تجدید کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

دورِ زوال میں جب کہ مسلمانوں کا نظامِ حکومت ختم ہو چکا تھا، اور اغیار نے ان پر غلامی کا نظام مسلط کر دیا۔ ایسے حالات میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تک ولی اللّٰہی جماعت نے دین کی اس جامعیت کو برقرار رکھا۔ انھوں نے اس دو ڈھائی سو سالہ دور میں اس خطے کی انسانیت کو غلامی سے نجات دلانے اور آزادی اور حریت سے ہم کنار کرنے کے لیے بڑی عظیم جدوجہد اور کوشش کی۔ امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ دارالحرب ہو یا حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا مجاہدانہ کردار، اور معرکہ بالاکوٹ میں اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنے کا عمل ہو یا 1857ء کی جدوجہدِ آزادی میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ

www.rahimia.org

مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کی کاوش اور کوشش ہو۔ یہ سب دین اسلام کی سیاسی تعلیمات کا اثر اور نتیجہ ہے۔ گویا سیاسی حوالے سے ان حضرات نے اس خطے کی مظلوم اقوام کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسی سلسلے کے اگلے دور کے سرخیل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کی ذاتِ گرامی ہے۔ انھوں نے 1857ء کے ظلم و ستم پر مبنی پُرآشوب دور کے بعد اس خطے میں جدوجہدِ آزادی کے لیے تحریک چلائی۔ اور علومِ نبوت کی اساس پر انسانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے بڑا بھرپور کردار ادا کیا۔ ایسے ماحول میں جب کہ ظلم و جبر کی وجہ سے آزادی اور حریت کی بات کرنا، جان جوکھوں کا کام تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رُفقا نے بڑی دلیری، جرأت مندی اور ہمت کے ساتھ تحریکِ آزادی کا علَم بلند کیا۔ اس تحریکِ آزادی کا پس منظر، اس کی حقیقت و ماہیت اور اس کے اثرات و نتائج کیا رہے؟ اس کا مطالعہ کرنا، اس دور کی بڑی بنیادی ضرورت ہے۔ اس تناظر میں اس شمارے میں ''شیخ الہندؒ اور تحریک آزادی'' کے عنوان سے ایک اہم اور مفصل مقالہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں مقالہ نگار نے بہت اہم مواد، بڑی عمدگی اور سلیقے کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یقیناً تحریکِ آزادی کے اہم پہلو کے حوالے سے یہ مقالہ بنیادی رہنمائی دے گا۔

تحریکِ آزادی کے ایک اہم فرد امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کی عربی خودنوشت سرگزشتِ حیات کی دوسری قسط اس شمارے میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس حصے میں جو مواد ہمارے سامنے آتا ہے، اس کا تحریکِ آزادی اور اس دور کی سیاسی تعمیر و تشکیل کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بیسویں صدی کے آغاز میں برِعظیم پاک و ہند کی سیاسی اور اقتصادی تشکیل نو کے لیے بڑے اہم افکار اپنی سرگزشتِ حیات میں بیان کیے ہیں۔ اس خطے کے سیاسی، معاشی، سماجی مسائل کیا ہیں؟ نیز مسلمان ملکوں میں جماعتوں، گروہوں اور رہنماؤں کی حقیقی نوعیت کیا ہے؟ عوام کے بنیادی تقاضے اور مسائل کے حل کرنے کی کوشش کن خطوط پر کرنی چاہیے؟ یہ اور اس سے ملتے جلتے دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں برِعظیم پاک و ہند کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تشکیل درست طور پر کیسے کی جاسکتی ہے؟ مولانا سندھیؒ نے اپنی سرگزشتِ حیات میں ان اہم سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ اس لیے سرگزشتِ حیات کے اس حصے کا مطالعہ اپنے اندر غور و فکر کے بہت سے پہلو رکھتا ہے۔ یقیناً قارئین کو اس سے بہت زیادہ استفادے کا موقع ملے گا۔

اس شمارے سے کتابوں پر تبصرے کا سلسلہ بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کے لیے یہ بھی عقل و خرد کے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرے گا۔ نیز حسبِ سابق آرا و تأثرات بھی پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو یہ شمارہ بھی پسند آئے گا۔ رسالے کو بہتر بنانے کے لیے آپ کی تجاویز اور آرا و تأثرات کا انتظار رہے گا۔

(مدیر اعلیٰ)

شخصیات

سرگزشتِ حیات

امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

''تحدیث العبد الضعیف بنعمة ربه اللطیف''

(عربی خودنوشت سوانح کا اُردو ترجمہ)

ترجمہ و تحقیق: مفتی عبدالخالق آزاد

(2)

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ایک عظیم الشان کتاب ''التمهید لتعریف آئمة التجدید'' تحریر فرمائی ہے۔ یہ کتاب آپ نے 1930ء میں مکۃ المکرمہ میں لکھی تھی۔ جس میں آپ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ سے لے کر اپنے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ تک اس دور کے مجددین کے سلسلۂ افکار و تعلیمات اور سلسلۂ اسناد و تسلسل کا تعارف پیش فرمایا ہے۔ آپ کی یہ اہم ترین تصنیف چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ ''تحدیث العبد الضعیف بنعمة ربه اللطیف'' کے عنوان سے ہے، جس میں حضرت سندھیؒ نے نہ صرف اپنی خودنوشت سوانح لکھی ہے، بلکہ حضرت شیخ الہندؒ اور ہزارۂ دوم کے مجددین سے اپنے تعلق اور ان کے تجدیدی اَفکار کی وضاحت بیان کی ہے۔

اس کتاب کی ہمیشہ سے علمائے کرام کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ چناں چہ مولانا عبدالحئ لکھنوی نے (والد گرامی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ) مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت اور مولانا سندھیؒ کے فکر اور نظریے کی وسعت بیان کی ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تالیفات میں سب سے بہترین کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ''التمهید فی آئمة التجدید'' ہے۔ جسے انھوں نے مکہ مکرمہ میں تالیف کیا تھا۔ اور شاہ ولی اللہؒ پر ایک مقالہ (شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف) جو ماہنامہ ''الفرقان'' کے خاص نمبر کے لیے لکھا تھا، یہ دونوں تالیفات مولانا سندھیؒ کے وسعتِ نظر اور فکری گہرائی پر دلالت کرتی ہیں''۔

آئندہ صفحات میں اس کتاب کے اس حصے کا اُردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا سندھیؒ نے اپنی اس خودنوشت سوانح میں اپنے حالاتِ زندگی، اپنے فکر و عمل کی تشکیل اور اس کے تدریجی ارتقا کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سندھیؒ شریعت میں ایک پختہ کار عالم ربانی، طریقت کے میدان کے شناور اور بہت سے مشائخ سے اجازت یافتہ ہیں۔ نیز سیاست میں ایک سچے اور مخلصانہ کردار ادا کرنے والے بے باک قائد، جرأت مند اور بہادر رہنما کے طور پر انقلابی کردار ادا کرنے والے اہم رہنما ہیں۔ یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی ہوئی خودنوشت سوانح سے زیادہ جامعیت کی حامل اور ممتاز ہے۔ مولانا سندھیؒ کی سوانح کا اشتیاق رکھنے والے لوگوں کے لیے اس میں بہت سی نئی اور مفید باتیں آ گئی ہیں۔ اس کی پہلی قسط گزشتہ شمارے میں آ چکی ہے۔ اب دوسری قسط پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

www.rahimia.org

باب (4): علمی اور سماجی خدمات

فصل (1): حضرت شیخ الہندؒ سے ملاقات اور ''دارالرشاد'' کا قیام

۱۳۱۵ھ (نومبر 1897ء) میں سات سال کے بعد میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی خدمت میں دارالعلوم دیوبند پہنچا۔ اور اپنی بعض تصنیفات ان کی خدمت میں پیش کیں۔ (1) اور بعض اشکالات اور سوالات کا حل ان سے دریافت کیا۔ احادیث کی کتابوں کے اطراف سنا کر براہِ راست دوبارہ اجازتِ حدیث حاصل کی۔ ان کتابوں میں صحاح ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ) کے ساتھ مسند امام احمد، امام طحاوی کی معانی الآثار، امام مالک کی مؤطا، جو امام یحییٰ کے واسطے سے روایت شدہ ہے۔ اور امام محمد کی روایت کردہ مؤطا۔ اور امام محمد کی کتاب الآثار شامل تھیں۔ احادیث کی ان کتابوں کو حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے پڑھنے میں کوئی سامع اور قاری میرے ساتھ شریک نہیں تھا۔

اس موقع پر ولی اللّٰہی علما کی کتابوں کے مشکل مقامات کے حل کے سلسلے میں بھی حضرت شیخ الہندؒ سے میں نے استفادہ کیا۔ خاص طور پر صدرالشہید (حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ) کی وہ تحریرات جو جہاد و سیاست کے بارے میں تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ ___ اللہ اپنی مغفرت کی چادر میں انھیں ڈھانپ لے ___ نے مجھے سنت کے پھیلاؤ اور اس کی دعوت کا صحیح طریقہ کار بھی سمجھایا۔ اس حوالے سے مَیں نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے بعض افکار و خیالات کو اپنے کاموں کے لیے نشانِ راہ بنا لیا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے حضرت شیخ الہندؒ سے استفادے کی توفیق دی۔ میں نے حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے اوپر انتہائی شفقت کرنے والا نہایت مہربان شخص پایا۔(2)

''دارالرشاد'' کا قیام

جب میں (دیوبند سے) سندھ واپس آیا تو دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ (سندھ میں) قائم کرنے کی فکر میں مشغول رہا۔ اور میں نے اپنی تمام تر توجہات اس جانب کرلیں۔ اس سلسلے میں مجھے بڑی مشقت برداشت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ۱۳۱۹ھ (1901ء) میں میرے لیے آسانی پیدا کردی۔ اور سندھ میں حیدرآباد کے قریب گوٹھ پیر جھنڈا میں امام ابوالتراب سید رُشد اللہ بن امام رشید الدین کے ساتھ مل کر میں نے ''دارالرشاد'' کی بنیاد رکھی۔

دارالرشاد میں شیخ حسین انصاری یمنی کا قیام

''دارالرشاد'' میں ہمارے استاذ حضرت حسین بن محسن انصاری یمنی نے بھی ایک مدت تک قیام کیا۔ میں نے ان کے سامنے امام بخاری کی صحیح، فتح الباری شرح بخاری، نیل الاوطار کا کچھ حصہ اور حدیث کی بڑی کتابوں کے اطراف پڑھے۔ نیز میں نے ان سے امام شافعیؒ کی فقہ پڑھی۔ وہ شافعی مسلک کے مجتہد عالم تھے۔ انھوں نے مجھے حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں کی روایت کی اجازتِ عامہ بھی عنایت فرمائی۔ اور حدیث کی کتاب ''مسلسلات'' کے روایت کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

میں اگرچہ ان کی صحبت میں تھوڑا وقت رہا، لیکن استفادہ بہت زیادہ کیا۔ میں نے انھیں دیکھا کہ وہ حافظ ابن حجر (عسقلانی) پر اُسی طرح اعتماد کرتے تھے، جیسا کہ میں امام ولی اللہ دہلویؒ پر پورا اعتماد کرتا تھا۔ میں نے ان کی صحبت سے اُن لوگوں کے طریقۂ حدیث کو سمجھنے میں مہارت حاصل کی، جو صحیح بخاری کو دیگر حدیث کی کتابوں پر مقدم سمجھتے ہیں۔ چناں چہ میں نے اس طریقۂ کار کو سمجھنے میں کمال حاصل کیا۔ اس طرح میرے لیے دونوں طریقوں — یعنی حافظ ابن حجر کے طریقے اور امام ولی اللہ دہلویؒ کے طریقے — کے درمیان موازنہ کرنا آسان ہوگیا۔ اور میرے لیے عصری تقاضوں کے تناظر میں ان دونوں میں سے زیادہ بہترین کو ترجیح دینے میں سہولت پیدا ہوگئی۔

دارالرشاد میں حضرت شیخ الہندؒ کی آمد

اس دوران میں نے ایک خواب میں دیکھا کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ ''دارالرشاد'' میں تشریف لائے ہیں، اور انھوں نے اس کے ایک کمرے میں قیام فرمایا ہے۔ (3) کچھ عرصے بعد ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ ''دارالرشاد'' تشریف لائے۔ اور اسی کمرے میں قیام فرما ہوئے۔ اس دن سے میں نے اپنے استاد کو امام مالکؒ سے تشبیہ دینا شروع کر دیا۔ اور اسی بات کے پیشِ نظر میں نے حضرت شیخ الہندؒ کا لقب ''نجم الائمہ'' رکھ دیا۔ اس لیے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ: ''جب علما کا ذکر کیا جائے تو امام مالکؒ ان میں نجم (روشن ستارے) کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (4)

جب ہمارے استاذ (حضرت شیخ الہندؒ) دارالرشاد تشریف لائے تو آپ سے ملاقات کے لیے راشد یہ سلسلے کے بہت سے مشائخ جمع ہوگئے۔ حضرت شیخ الہندؒ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ پھر ہم نے ''جمعیۃ سوادِ اعظم'' کے عنوان سے سندھ کے علما کی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے مولانا محمد صادق سندھی (کھڈہ، کراچی والے) نے بہت زیادہ محنت اور جدوجہد کی۔

جب ''دارالرشاد'' سے فارغ ہونے والے علما نے امام ابوالتراب کے زیرنگرانی دارالرشاد کو منظم انداز میں چلانے کی استعداد حاصل کر لی، تو حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے ۱۳۲۷ھ (1909ء) سے دارالعلوم (دیوبند) میں قیام

کرنے کا حکم فرمایا۔

فصل (2): ''جمعیۃ الانصار'' کا قیام

۲۷/ رمضان المبارک سن ۱۳۲۷ھ (1909ء) کو مدرسہ دیوبند میں ''جمعیۃ الانصار'' قائم ہوئی۔ اور میں دارالعلوم کے شعبۂ دعوت وارشاد سے متعلق ہوگیا۔ اور دارالعلوم (دیوبند) اور اس سے ملحقہ اور وابستہ اداروں سے فارغ التحصیل علما کو ''جمعیۃ الانصار'' کے عنوان سے منظم کرنے میں مشغول ہوگیا۔ تاکہ ظاہری طور پر طے شدہ پروگرام کی بنیاد پر ایک علمی اور فکری جماعت وجود میں آجائے۔

دارالعلوم اور اس سے ملحقہ اداروں سے گزشتہ چالیس سال (۱۲۸۳ھ تا ۱۳۲۷ھ/ 1866ء تا 1909ء) کے عرصے میں 20 ہزار سے زائد علما تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے تھے۔ اور پانچویں دہائی میں ان کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ان کے ذریعے سے ولی اللّٰہی طریقۂ فکر وعمل ہندوستان کے تمام اطراف میں پھیل چکا تھا۔ ان میں بعض جماعتیں کابل، بخارا اور حجاز میں بھی موجود تھیں۔ اور دیوبند کے تعلیم یافتہ علما اس آباد دنیا کے بہت سے ممالک یورپ، چین، افریقہ اور امریکہ تک پہنچ چکے تھے۔

''جمعیۃ الانصار'' کے اہم ترین کام

اس علمی اور دینی جمعیۃ المؤتمر کے عمدہ کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے تحت مدارسِ دینیہ سے فارغ ہونے والے علما اور عصری اداروں سے تعلیم یافتہ گریجویٹس دونوں کے لیے شرعی اور دینی علوم کی تکمیل کا نظام قائم کیا گیا۔ اور دوسرا اہم ترین کام اس جمعیۃ کا یہ تھا کہ ہلالِ احمر کے تحت (ترکوں کی امداد کے لیے) فنڈز اکٹھے کیے جائیں۔ اس کی تمام تر تفصیلات اس زمانے کے رسالوں اور کتابوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ (5) اس قسم کے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے مجھے تقریباً چار سال کا عرصہ گزر گیا۔

قیامِ دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ

اس دوران میں نے حضرت شیخ الہندؒ سے شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم کی کتاب ''حجۃ الاسلام'' اور (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب) ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے اَطراف پڑھے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ میں نے اس دوران اس بات کو اچھی طرح سمجھا کہ ہمارا اُن مسلمان جماعتوں کے ساتھ اتحاد کس طرح ممکن ہے، جو اپنے بعض کاموں میں ہمارے طریقے کے مخالف ہیں۔ اور کن اُمور پر غیر مسلم اہل وطن سے اتفاق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے اس قسم کے معاملات میں آزمائش سے دوچار ہوا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے — اللہ ان پر رحمت نازل کرے — اس سلسلے میں میری اچھی طرح رہنمائی فرمائی۔

ہمیشہ آپ کی رہنمائی کا دارومدار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کی مشہور ومعروف سنتِ صحیحہ سے

اَخذ واستنباط پر مبنی ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں عام طور پر وہ اپنے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا کوئی قول نقل کرتے تھے اور اگر انھوں نے خود استنباط کیا ہوتا تو اس کی نشان دہی کر دیتے، لیکن وہ اپنے استنباط سے زیادہ اپنے استاذ کے اَخذ واستنباط پر اعتماد کرتے تھے۔

میں نے مسلمان جماعتوں کا بڑی اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے کہ جب ان میں کوئی طبقہ بدلتے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کتاب وسنت سے احکامات کو اخذ واستنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو ان کے لیے مذہب کی بنیاد پر سیاست کے میدان میں کام جاری رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے کہ سیاست کے تقاضے ہر روز بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہر گھڑی اس کے مختلف مظاہر سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس طرح مجھے پورا یقین ہوگیا کہ مذہب کے بنیادی اساسی اصولوں کے دائرے میں رہ کر بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے علمی سطح پر اجتہاد واستنباط کا کام ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی قوم کی عملی سیاست کرنا اور کسی قوم کی دفاعی اور جنگی حکمتِ عملی طے کرنا۔ اگرچہ ان دونوں کاموں کے درمیان درجات کا فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بڑی اہم ہے کہ کسی مملکت میں بسنے والے لوگوں کے لیے ایسے مذہب کی پابندی اختیار کرنا اپنے اندر بڑا خیر کا پہلو رکھتا ہے، جو حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

فصل نمبر(3): دیوبند اور علی گڑھ کے اتحاد کی کوشش

ہم نے علی گڑھ کی جماعت کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی بڑی کوشش کی۔ اس لیے کہ ہم ان کے ساتھ امام ولی اللہ دہلویؒ کی اتباع کرنے میں باہم شریک ہیں۔ اس بات کے باوجود کہ دوسرے درجے میں ہمارے درمیان علمی نقطۂ نظر سے مسلک کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیوبند اور علی گڑھ دونوں جماعتوں کے اساسی رہنما (سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) ان لوگوں میں سے ہیں جو دہلی کالج میں مولانا مملوک العلی نانوتویؒ سے علم حاصل کرنے میں باہم شریک رہے ہیں۔ (6) اور سیاسی طریقۂ کار کے اختلاف کے علاوہ ان کے درمیان کوئی ایسا اختلاف نہیں پایا جاتا کہ جس کے سبب مستقل دشمنی پیدا ہو۔

جب علی گڑھ سے تعلق رکھنے والوں میں ایک ایسی جماعت وجود میں آگئی، جس کا سیاسی میلان ہمارے سیاسی میلان کے مطابق ہوگیا، تو دونوں جماعتوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا مزید آسان ہوگیا۔ چناں چہ آہستہ آہستہ ہم نے اتحاد کی طرف پیش قدمی کی کوشش جاری رکھی۔ اور اس کے لیے ہماری جماعت نے بہت سے سخت مشقت والے کام بھی اپنے ذمے قبول کیے۔ چناں چہ ایسے معاملات میں ہم نے انھیں آگے رکھا، جہاں وہ آگے رہنا پسند کرتے تھے۔ اس طرح ہم اللہ کے شکر سے اپنے سیاسی مسلک کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ خواہ بعض کاموں میں ہم سامنے رہے یا پیچھے چلے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ اس قسم کے کاموں پر بڑی

www.rahimia.org

گرفت رکھتے تھے۔ میں نے قوموں اور جماعتوں کے قائدین میں ایسے لوگ نہیں دیکھے۔

دیوبندی جماعت کی یک جہتی اور حضرت شیخ الہندؒ کا کردار

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ اس بات پر بڑا افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ دیوبندی جماعت میں ایک ایسا گروہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو اس طریقے کے رہنماؤں کے برعکس کردار ادا کر رہا ہے۔ اور انھوں نے مجھے ان کے چند غلط کاموں کے بارے میں بھی بتلایا۔ لیکن ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی یہ عظمت ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اپنی حکمت عملی سے اس گروہ کو اپنی مخالفت کے اعلانیہ اظہار سے روکے رکھا۔

ان مخالفین میں سے بعض ذہین لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ سیاسی مسلک کے حوالے سے دیوبند کے رہنماؤں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ایسے لوگ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے متبعین کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے متبعین پر ترجیح دیتے تھے۔ اور اس تفریق سے ان کا غلط مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنے آپ کو اس کی آڑ میں چھپائیں۔ ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے بعض ایسے اُمور سے آگاہ کیا تھا، جن کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ اور جو دونوں مشائخ (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) کے اتحادِ مسلک پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں حضرات کے کام کرنے کے طریقۂ کار میں کوئی فرق تھا بھی تو وہ زمان و مکان کے تغیر و تبدل اور حالات و واقعات میں تبدیلی کی وجہ سے تھا۔ اس سے اِن لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا۔ اس لیے کہ یہ لوگ خود اپنی شخصیات کے داخلی مزاج کی وجہ سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے طبعی مزاج کے درمیان فرق دیکھتے ہیں۔

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے اپنے دونوں مشائخ کی اتباع کرنے پر اُبھارنے کے لیے ایک طویل قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں ان دونوں مشائخ کے فضائل و مناقب بیان کیے ہیں۔ اس حوالے سے حضرت شیخ الہندؒ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات کے بعد دیوبندی جماعت کے درمیان اتفاق و اتحاد کے ''قیوم'' ہیں۔ اس لیے کہ اگر حضرت شیخ الہندؒ جس طرح اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ کی پیروی کرتے تھے، اسی طرح اگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی اتباع نہ کرتے تو حضرت نانوتویؒ سے خصوصی تعلق رکھنے والے لوگ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے کٹ جاتے، اور جماعت میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندیؒ کے سامنے ایک واقعے کے ضمن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی روح متمثل ہوکر آئی۔ انھوں نے اس طرح کا اشارہ دیا کہ وہ ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کو حکم دیں کہ ''مدرسے کی مصلحت کا خیال رکھیں''۔ چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ اس کے سامنے جھک گئے اور انھوں نے

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو راضی رکھنے اور ان کی رائے کی مکمل اتباع کرنے کے لیے اپنی ذات اور شخصیت کو بالکل مٹا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ بعض کاموں میں حضرت گنگوہیؒ کی نظروں میں ان لوگوں پر سبقت لے گئے۔ جنھوں نے براہِ راست حضرت گنگوہیؒ سے علم حاصل کیا تھا۔ **رحمهم اللّٰه و قدّس أسرارهم** (اللہ ان پر رحم فرمائے، اور ان کی روحوں کو مقدس مقام تک پہنچائے)

فصل نمبر(4): ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا قیام

جب حکومتِ برطانیہ نے اپنا ہندوستانی دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل کرلیا۔ اور تمام سیاسی جماعتیں اس نئے مرکز میں جمع ہوگئیں تو حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے میں ۱۳۳۱ھ (1913ء) کو دہلی میں قیام پذیر ہوگیا۔ وہاں میں نے (13 جون 1913ء کو) ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس مرکز میں ''الفوز الکبیر'' کے تفسیری اُصولوں کی روشنی میں فن ''اعتبار'' کے طریقۂ کار کو سامنے رکھتے ہوئے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس دیا جاتا تھا۔ اس ادارے میں مسلمان زُعما میں سے بڑے لوگ جیسے علی گڑھ سے نواب وقار الملک، دہلی سے فصیح الملک حکیم محمد اجمل خان، دیوبند سے ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ شریک تھے۔

''نظارۃ'' کے مقاصد واَہداف

اس ادارے میں نوجوان علمائے دین اور نوجوان مسلمان سیاسی رہنما ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ اگر مستقل طور پر یہ کام کرنا ہمارے مقدر میں ہوتا تو اس سے مسلمانوں کو بڑا عظیم فائدہ پہنچتا۔ اگر آپ اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پھر امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفۂ شریعت کا خلاصہ سنیے:

شریعتِ اسلامی کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کو اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ عقائد واَخلاق میں اور سیرت وکردار میں منظّم انداز میں آگے بڑھایا جائے۔ اور یہ کام انفرادی سطح پر بھی ہونا چاہیے اور اجتماعی سطح پر بھی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب اجتماعی سطح پر انسانی زندگی کو منظّم کرنے کی بات آئے گی تو انسانی اجتماع کی درجِ ذیل شکلیں ہوتی ہیں:

(1) یہ اجتماع کبھی ناقص اور ادھورا ہوتا ہے، جیسے گھر، گلی، محلّہ اور بستی کی سطح کی اجتماعیت۔

(2) یہ اجتماع کبھی درمیانے درجے کا ہوتا ہے، جیسے قومی سطح کی ایسی شہری حکومت جو بستیوں اور محلوں پر اپنی ہیئتِ حاکمہ قائم کرتی ہے۔

(3) یہ اجتماع کبھی مکمل سماجی زندگی اور کامل حیثیت لیے ہوئے ہوتا ہے، جیسے بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کے باہمی اشتراک پر مبنی بین الاقوامی سطح کا سیاسی ومعاشی نظام وغیرہ۔

انسانی زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی اعمال کا پہلا نتیجہ ''دنیا'' کہلاتا ہے۔ جب کہ دوسرا نتیجہ اور پہلے نتیجے کا

نتیجہ ''آخرت'' کہلاتا ہے۔

علم میں مشغول رہنے والوں میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کی نظر عقائد اور اَخلاق پر زیادہ رہتی ہے۔ جب کہ سماج سے متعلق اجتماعی کاموں کو منظم کرنے کی طرف ایسے لوگ صرف بقدرِ ضرورت اور ذیلی اور ضمنی طور پر ہی توجہ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ''دینی فرد'' کہا جاتا ہے۔ اور جب اہل علم میں سے کسی فرد پر سماج سے متعلق اجتماعی کاموں کو منظم کرنے کا فکر غالب ہو۔ اور وہ عقائد و اَخلاق اور انفرادی اعمال کی طرف بقدرِ ضرورت توجہ دے، اسے ''سیاسی فرد'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح ''دین'' اور ''سیاست'' کو مختلف سطحوں پر باہم ایک جگہ جمع کرنے سے اہل علم کے بہت سے طبقات وجود میں آجاتے ہیں۔(7)

حالات و واقعات اور زمانے کے تغیرات کی وجہ سے جدید تقاضے اُبھرتے ہیں اور نئے اختلافات سامنے آتے ہیں۔ اس تناظر میں جدیدیت کے اثرات عقائد و اَخلاق کے مقابلے میں سماجی تشکیل کے اجتماعی کاموں پر زیادہ پڑتے ہیں۔ جب کہ تغیراتِ زمانہ کی وجہ سے عقائد و اَخلاق پر اتنے اثرات نہیں پڑتے۔ اس لیے عام طور پر دینی لوگوں کی طبیعت میں تقلید کرنے اور دوسروں کی اتباع کرنے کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ جب کہ سیاسی افراد کو جدید تقاضے کے تناظر میں سماجی، سیاسی مسائل حل کرنا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی طبیعت میں اجتہاد اور نئی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ اور امت کو ان دونوں طرح کے افراد کی ضرورت رہتی ہے۔ اپنی مساجد میں (عقائد و اَخلاق کی درستگی کی) اور اپنے بازاروں میں (اقتصادی، معاشی اور سماجی اُمور کو حل کرنے کی)۔ اور جب دینی اور سیاسی طبقے کے سرکردہ رہنماؤں کے درمیان باہم مصالحت غالب ہو۔ اور یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا کام نہ کریں تو یہ بات دنیا و آخرت میں بہت ہی زیادہ خیر و برکت کے دروازے کھولنے کا باعث بنتی ہے۔

''نظارۃ'' کا طریقۂ تعلیم و تربیت

ہم نے ''مدرسہ نظارۃ المعارف'' میں دونوں طبقوں کے پانچ پانچ افراد اکٹھے کیے۔ اور ان کو ایک جماعت کی صورت دے دی۔ اور ان میں سے ہر ایک کا دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا معاہدہ کرادیا۔ ایک فرد اس طبقے سے لیا تو دوسرا فرد دوسرے طبقے سے لیا۔ اور ان دونوں کو ایک فردِ واحد کی طرح قریبی بھائی بنادیا۔ اور پھر ان کو درجِ ذیل امور میں مشغول کردیا:

(1) ''فن اعتبار'' کے اصول پر قرآن حکیم اور کلام اللہ میں غور و فکر۔

(2) تحقیقی نقطۂ نظر سے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تعلیم۔

(3) یورپ کی غالب سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی اجتماعی تقاضوں کے درمیان باہمی موازنہ۔

اس کے نتیجے میں ان لوگوں میں نظم و ضبط کے اندر رہتے ہوئے اجتہادی اور تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما بڑے ہی منفرد انداز میں پیدا ہوئی۔ اور ہم ایسے تربیت یافتہ افراد سے اس بات کی اُمید رکھتے ہیں کہ وہ دہلی کے تباہ

ہوجانے والے امن اور اس کی خوش حالی کو دوبارہ زندہ کرنے کا سبب بنیں گے۔ اور فصیح الملک دہلوی کی یہ دعا ضرور قبول ہوگی:

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم الٰہی پھر اسے حسب ِمراد دیکھیں ہم

لیکن اس دوران جنگِ عظیم اوّل شروع ہوگئی اور حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے میں نے ۱۳۳۳ھ (1915ء) میں ہندوستان چھوڑ دیا اور ہجرت کرلی۔ اور حکومتِ برطانیہ کے حکم سے سن ۱۳۳۵ھ (1916ء) میں ''مدرسہ نظارۃ المعارف'' اور سندھ میں ''مدرسہ دارالرشاد'' بند کردیے گئے۔

فصل نمبر(5): جماعتوں سے اشتراکِ عمل کے اصول

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ اس بات کو درست نہیں سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا مرکز ہندوستان سے باہر منتقل کیا جائے۔ لیکن یہ ضروری قرار دیتے تھے کہ ہندوستانی مرکز مسلمان شہروں اور ملکوں سے متصل ہو۔ پس ''نظارۃ المعارف'' نے یہ قرار دیا کہ دین کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت برطانیہ بھیجی جائے۔ اور مسلمانوں کو تیار کیا جائے کہ وہ ان کے ساتھ تعاون اور مدد کریں۔ لیکن ہندوستانی حکومت نے اس سلسلے میں ہم سے تعاون کرنے والے بعض رہنماؤں پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ (8)

چناں چہ ہمیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ ہندوستانی لوگوں کا برطانیہ میں تبلیغ اسلام کے لیے جانا برطانوی حکومت کے لیے صرف اس شرط پر قابل قبول ہوگا کہ ہندوستان پر اس کی حکومت کو ہمیشہ کے لیے قبول کرلیا جائے۔ اسی لیے برطانوی حکومت قادیانی جماعت کے مبلغین کو برطانیہ میں تبلیغ کرنے سے نہیں روکتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قادیانی جماعت کی سیاست برطانیہ کی سیاست کے تابع تھی۔.....

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے ہمیں سمجھایا کہ اسلام کے نام پر کام کرنے والی جماعتوں کے ساتھ معاملہ اُسی وقت کیا جائے، جب کہ اشتراکِ عمل کے بنیادی اُمور، دائرۂ کار اور شرائط واضح طور پر متعین ہوں۔ اور چوں کہ معاملہ لازمی طور پر دین کا ہے، اس لیے گُم راہ فرقوں کے ساتھ اشتراک کرنے والا فرد ایسا ہونا چاہیے، جس پر پورا اعتماد ہو کہ وہ ان کے اثرات قبول نہیں کرے گا۔

جہاں تک غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کا تعلق ہے۔ تو اس سلسلے میں بھی صرف کسی ایک فرد کی اجتہادی رائے پر ہی اعتماد نہ کیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے مسلمان ملک کے حکمران سے مشورہ کیا جائے، جو سیاست میں اپنے مستقل کردار کا مالک ہو۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ کابل کے سلاطین کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے کہ ہندوستان کے ساتھ ان کے کئی طرح کے رشتے موجود ہیں۔ اور وہ ہندوستان کے حالات کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔

www.rahimia.org

باب (5) ہجرتِ کابل

فصل (1): کابل کا سفر

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی یہ عادت تھی کہ وہ براہِ راست حکم دینے کی بجائے مشورے کے طور پر بات کیا کرتے تھے۔ جنگِ عظیم اوّل سے دو سال پہلے آپ نے اسی انداز میں ہمیں کچھ کام کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ہم میں سے کسی کی بھی توجہ اس جانب نہ ہوسکی۔ لیکن جب ترکی کے خلیفۃ المسلمین نے اس جنگ میں شمولیت اختیار کرلی، تو اب ہم حضرت شیخ الہندؒ کا مقصد سمجھے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کے مشورے کو سمجھنے میں ہم سے جو کوتاہی ہوئی، اس سے ہمیں بڑی تکلیف ہوئی۔ چناں چہ مجھے حضرت شیخ الہندؒ نے کابل جانے کا حکم دیا۔ پھر میں نے اپنے بہت سے دوستوں سے بھی حضرت شیخ الہندؒ کا حکم بتلائے بغیر مشورہ لیا تو تمام نے مجھے ہجرت کا ہی مشورہ دیا۔

جہاں تک میرا اپنا معاملہ تھا۔ تو مجھے اپنے بارے میں ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ میں اس سلسلے میں کچھ کرنے کی طاقت اور قدرت رکھتا ہوں۔ اور اس لیے بھی کہ کتاب وسنت کے علوم میں میری تحقیقی جدوجہد و کوشش اور سیاست کے میدان میں میرے افکار ایسے تھے کہ جو شہروں کی مروجہ سیاست اور عام افغانیوں کی طبیعتوں سے موافقت نہیں رکھتے تھے۔

چناں چہ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے دہلی سے (شروع اپریل 1915ء میں کابل ہجرت کے ارادے سے) سندھ کا سفر کیا۔ اور وہاں چار مہینے رہا۔ معاملہ بڑا سخت تھا۔ اس لیے کہ حکومت میری پوری نگرانی کر رہی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور توفیق سے میرے لیے راستہ آسان کردیا۔ میں نے ۳ شوال ۱۳۳۳ھ (15 اگست 1915ء) کو سندھ سے قندھار کا سفر شروع کیا۔ ہم نے ریل گاڑی کوئٹہ، بلوچستان میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اور اس کے بعد کا سفر پیدل، بیل، اونٹ اور گھوڑے پر سواری کے ذریعے کیا۔ اور ذی الحج ۱۳۳۳ھ کے پہلے عشرے میں (15 اکتوبر 1915ء کو) مَیں کابل پہنچا۔ (9) قریب زمانے میں ہی بیس سے تیس تک نوجوانوں نے ہجرت کی تھی۔ اس طرح ہماری ایک جماعت بن گئی۔ سلطانِ کابل، اس کی حکومت اور عملے نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اور یہ تمام اللہ کے فضل سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

فصل (2) ''جنود اللہ الربانیہ'' کا قیام

میں کابل میں تقریباً سات سال رہا۔ ہم نے مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی، علمی اور تربیتی جماعت بنائی۔ اس

www.rahimia.org

کا نظام عسکری بنیاد پر کام کرتا تھا۔ (10) اس کا نام ہم نے ''جنود اللہ الربانیہ'' رکھا۔ ہم نے اسی کی ذیلی تقسیم کی، جو کہ سو (100) لشکروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے دس لشکر ہندوستان کے لیے۔ دس لشکر دریائے سندھ کے پار علاقے اور افغانستان کے لیے۔ ہم سندھ پار کے علاقے اور افغانستان کے لشکروں کو منظم کرنے میں مشغول ہوگئے۔ اس لیے کہ ہمارے بھائیوں اور راشدی مشائخ کی وساطت سے سندھ اور بلوچستان میں ہمارے لشکر ''دار الرشاد'' کی بنیاد رکھنے کے زمانے سے پھیلے ہوئے تھے۔

پشتانیہ اور پشاور کے علاقے میں افغانستان سے ہجرت کرنے والی ایسی جماعتیں موجود تھیں، جو ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے تصوف وغیرہ میں اپنی نسبت رکھتی تھیں۔ اور پھر دار العلوم دیوبند کے فارغ شدہ علما کو میں ''جمعیۃ الانصار'' کے آغاز کے زمانے سے جانتا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس زمانے میں اپنے ان شاگردوں میں یہ بات اچھی طرح پھیلا دی تھی کہ وہ میرے احکامات کی اسی طرح اطاعت کریں، جیسا کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی کرتے ہیں۔ جب میں اس بات سے واقف ہوا تو میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ اس طرح میرے لیے کام کرنا آسان ہوگیا۔

''جنود الربانیہ'' کے اہم کام

تنظیم ''جنود اللہ الربانیہ'' کا ایک بڑا اہم کام حکومت افغانستان کے بعض افراد کی تعلیم و تربیت کرنا بھی تھا۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جنگِ عظیم اوّل کے بعد جمہوری اصولوں پر خلافتِ اسلامیہ کی اصلاح کی جائے۔ اس تنظیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان جماعتوں میں سے ہر ایک جماعت اقتصادیات، سیاسیات اور علم و شعور کے حوالے سے اپنی زیادہ سے زیادہ اصلاح کرے۔

پھر ہم نے حکومتِ افغانستان کے ساتھ شریک ہوکر ہندوستان، ایران اور ترکستان میں اپنے وفود بھیجے۔ اس دوران ہمارے بعض افراد اتحادیوں کے ہاتھوں پکڑے گئے۔ جس کی وجہ سے ہمارے لیے کام کرنا بہت مشکل ہوگیا۔ اسی طرح ۱۳۳۵ھ (1917ء) میں ان لوگوں پر بھی سختی شروع ہوگئی، جو ہندوستان میں ہمارے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔

فصل (3): جماعتِ مجاہدین کے ساتھ اشتراکِ عمل کی کوشش

میں نے ۱۳۳۸ھ (1919ء) میں ''جماعتِ مجاہدین'' اور ان کے امیر شیخ عبدالکریم بن امیر مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے ملاقات کے لیے سفر کیا۔ میں ان کے پاس چند ہفتے ٹھہرا۔ اس ملاقات سے جو ہمارا مقصد تھا، غلط فہمی کی وجہ سے وہ پورا نہ ہوسکا۔ اس بنا پر ہم نے ایک اور طرح کی تنظیم قائم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ کچھ دنوں کے بعد ''علمائے رحیم آباد'' نے انھیں صحیح معلومات پہنچائیں تو اس غلط فہمی کا پردہ چاک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ لیکن اب اس قدر تاخیر ہوچکی تھی کہ ہمارے لیے دوبارہ سے معاملات کو درست کرنا ممکن نہ رہا۔ البتہ ہمیں اپنی اس جدوجہد و کوشش سے پورا فائدہ حاصل ہونے لگا۔ اور عظیم آبادی جماعت کے رہنماؤں نے ان تمام اُمور

www.rahimia.org

میں ہمارے ساتھ پورا تعاون شروع کر دیا، جن کاموں کا بھی ہم نے ان کے حوالے سے ارادہ کیا۔ اور ہمارے اہل حدیث بھائیوں کی قیادت کے تحت تمام کاموں میں ان کی جماعتِ مجاہدین اشتراکِ عمل کے لیے تیار ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے فائدے کے لیے ان میں برکت دے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی توفیق اور اس کی مہربانی سے بڑے بڑے کام سرانجام دیے ہیں۔

فصل (4): کابل میں ''ہندوستانی یونیورسٹی'' کے قیام کی کوشش

ہندوستان کے سیاسی حالات کی مزید تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم نے کابل میں جو کام کیے، ان کا تذکرہ یہاں صرف مجمل اشارات کی صورت میں ہم نے اس لیے بیان کر دیا تا کہ واقعات کا تسلسل بتلا دیا جائے۔

جب ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم حریت پسند جماعتوں نے اپنی اجتماعی طاقت افغانستان میں جمع کر لی۔ اور وہاں ہمیں ایک طرح کی مرکزیت حاصل ہوگئی تو ہم نے کابل میں ایک ''ہندوستانی یونیورسٹی'' قائم کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کا ناظم تھا۔ میں نے اس کا بنیادی پروگرام امیر امان اللہ خاں کے سامنے پیش کیا۔ میں نے افغان حکومت کے ساتھ یونیورسٹی کے ظاہری معاملات میں اشتراکِ عمل تجویز کیا تھا۔

اگر اس یونیورسٹی کا قیام اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو (۱) ہندوستانی مسلمان، (۲) ہندو اور (۳) افغانیوں کی صورت میں افغانستان میں موجود مثلث کے درمیان اتفاق ہوجاتا، لیکن سیاسی رُکاوٹوں نے ہمیں اس کام کو مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اس میں ناکامی کی نتیجے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان باہمی اختلافات پیدا ہوگئے۔ دراصل مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتفاق واختلاف کا دار و مدار افغانیوں کے اس میں شامل ہونے یا نہ ہونے پر تھا۔

کابل میں ''انڈین نیشنل کانگریس'' کا قیام

افغانستان میں ہندوستانی حریت پسندوں کے اس مرکز کے تحفظ کے لیے میں نے کابل میں ''انڈین نیشنل کانگریس'' کے سیاسی شعبے کی بنیاد رکھی۔ اور میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ بنا۔ ہم نے ہندوستان میں کانگریس سے اپنے الحاق کی درخواست پیش کی، تا کہ جواب دہی کے عمل میں ہماری شرکت ہوجائے۔ چناں چہ کانگریس نے اپنے اس سیشن میں ہمارا الحاق قبول کرلیا، جو عظیم ہندوستانی لیڈر چترنجن داس بنگالی کی قیادت میں ''گیا'' میں ہوا تھا۔ کانگریس کی یہ پہلی شاخ تھی۔ جو برطانوی شہنشاہیت کے دائرے سے باہر قائم کی گئی تھی۔ (11)

فصل نمبر (5): کابل میں ''ہندوستانی عارضی حکومت'' کا قیام

جرمنی اور ترکی کی طرف سے ہندوستانیوں کی قیادت میں ایک سیاسی وفد ۱۳۳۴ھ (1916ء) میں افغانستان آیا تو میں نے کابل میں ''عارضی ہندوستانی حکومت'' قائم کی۔ میں اس کے حکومتی ڈھانچے کا ایک اہم رُکن تھا۔ لیکن

جب ہم نے ۱۳۳۷ھ (1919ء) میں افغانوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں افغان حکومت کے ساتھ اشتراکِ عمل اختیار کیا تو میں اس حکومت کا صدر تھا۔ اور عارضی صلح کے بعد ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرائی۔ تاکہ حکومتِ افغانستان کو اپنے خارجی مسائل کو برابری کی سطح پر حل کرنے کی سہولت حاصل ہوجائے۔ اور مسلمانوں کو افغانستان کی طرف ہجرت پر اُبھارنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ چناں چہ سیاسی معرکوں میں مَیں نے حکومتِ افغانستان کی بڑی مدد کی۔

مَیں نے (حکومتِ افغانستان کے توسط سے) حکومتِ برطانیہ کے نائب سے اس بات کا معاہدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو آئندہ دس سالوں کے عرصے میں داخلی آزادی اور حریت دیں گے۔ پھر جب اس عہد کو پورا کرنے کا وقت قریب آیا اور ہندوستانی لوگ آزادی کے مطالبے کے لیے تیار ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ افغانستان میں اُس حکومت کے خلاف انقلاب آگیا، جس نے برطانیہ سے معاہدہ کیا تھا۔ اور جو ہندوستانی معاملات کے حوالے سے اس معاہدے میں شریک تھی۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (۸۶:۱۲)، (میری شکایت اور میرا غم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہی ہے۔) **وهو أعلم بحقائق الواقعات و عواقب الأُمور** ۔ (اور وہ واقعات کی حقیقتوں اور کاموں کے نتائج کو زیادہ جانتا ہے۔)

فصل (6): شیخ الہندؒ کی مالٹا میں گرفتاری اور رہائی

جس سال میں ہندوستان سے کابل کی جانب روانہ ہوا، اُسی سال موسمِ حج میں ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لائے۔ پھر (۱۸ر ربیع الاول) ۱۳۳۵ھ (12 جنوری 1917ء) میں آپ کو حجاز سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیا گیا۔ اس سلسلے میں کابل کے واقعات کا بڑا دَخل ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ ۲۱ر جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ (12 مارچ 1920ء) کو مالٹا سے رہا ہوئے۔ اور جب ہندوستان تشریف لائے تو انھوں نے ''جمعیۃ الانصار'' کے نقش قدم پر ''جمعیۃ علمائے ہند'' کی بنیاد رکھی۔ اور اسی طرح جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی۔ اور مدرسہ ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' — جسے انگریزوں نے بند کر دیا تھا — جامعہ ملیہ میں مدغم کر دیا۔

میں نے ایک خواب میں دیکھا کہ ایک بہت ہی صاف ستھری اور عمدہ مسجد بنی ہوئی ہے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ مجھ سے فرما رہے ہیں کہ: ''میں نے یہ مسجد بنائی ہے۔ اور اس میں میرے ساتھ تیرے سوا اور کوئی شریک نہیں۔'' میں اس پر بہت خوش ہوا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی اس کی توفیق دینے والے ہیں۔

اور جب حضرت شیخ الہندؒ کا ۱۳۳۹ھ/ اکتوبر 1920ء میں انتقال ہوگیا تو سلطان امان اللہ خاں نے دعا کے لیے مسلمانوں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس لیے کہ حنفی لوگ غائبانہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے۔ لوگوں کا بہت بڑا اجتماع ہوگیا۔ جمع ہونے والے لوگ بیس ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ سلطان نے بڑا عمدہ اور فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ اور اس میں یہ

جملہ بھی کہا کہ: ''وہ کام جسے حضرت شیخ الہندؒ نے شروع کیا تھا، انشاء اللہ میں اُسے مکمل کروں گا۔'' اس موقع پر سلطان نے تمام لوگوں کو کھانا بھی کھلایا۔ اس دن لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔

باب (6) استنبول کی طرف سفر

فصل (1): کابل سے روس کا سفر

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی جانب سے مجھے یہ اجازت تھی کہ بوقت ضرورت میں کابل سے نکل کر استنبول چلا جاؤں۔ چناں چہ ۲۳ر صفر ۱۳۴۱ھ (15 اکتوبر 1922ء) کو مَیں کابل سے نکلا۔ اس لیے کہ افغانوں اور انگریزوں کے درمیان جب صلح مکمل ہوگئی تو (ہندوستانی) مؤتمر کے سیاسی شعبے کے ارکان کے لیے افغانستان میں قیام بڑا مشکل ہوگیا۔ افغانستان میں قیام کی اس کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں تھی کہ ان کے نظاموں کو توڑا جائے اور ان کے سیاسی مسلک میں تبدیلی آئے۔

ہم یہ ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ مشرقِ قریب میں انقلاب آنے کے بعد کے حالات کا جائزہ لیں۔ اور ہم یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے اختیار کردہ پروگرام پر ہی چلیں، یا اس میں کوئی تبدیلی ضروری ہے۔ اور کیا ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی رُجحانات اور عام مشرقی لوگوں کے رُجحانات میں کوئی تطبیق ممکن ہے۔ جس کی بنا پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے اور انقلاب کے ارتقا کے لیے ہم کوئی نئی بنیاد دریافت کرسکیں۔

شمال کی جانب جانے کے سوا ہمارے لیے افغانستان سے نکلنے کے تمام راستے بند تھے۔ اس لیے ہم نے اشترا کی روس کے وکیل کے ساتھ اس سلسلے میں بات کی۔ اُس نے ہمیں خوش آمدید کہا اور جب ہم روس کی حدود میں داخل ہوئے اور ہم نے دریائے جیحون عبور کیا تو اُس نے راستے کی سہولت پیدا کرنے کے لیے ہماری بڑی مدد کی۔(12)

فصل (2): اشترا کی انقلاب کا مطالعہ اور فلسفہ ولی اللّٰہی کی اہمیت

اپنے مطالعے (مئی 1891ء تا 1900ء) کے دنوں میں امام ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک کی تحقیق کے لیے میں نے فلسفے کی بعض کتابیں پڑھی تھیں۔ ان میں ''شرح حکمت الاشراق''، ''اسفارِ اربعہ''، ''مقدمہ ابن خلدون'' شامل ہیں۔ اور ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے ''تاریخِ فرشتہ''، ''آئینِ اکبری''، ''سیر المتأخرین'' اور ابن اثیرؒ کی

''تاریخ الاسلام الکامل'' کا میں نے مطالعہ کیا تھا۔

پھر جب میں نے (1901ء میں) ''دارالرشاد'' کی بنیاد رکھی تھی تو اردو زبان میں علی گڑھ کی جماعت نے اس سلسلے میں جو کچھ شائع کیا تھا، میں نے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس زمانے کے بہت سے رسائل اور مجلّات کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اسی طرح دیگر ایسی کتابیں جو میرے مطالعے میں رہیں، ان میں سپنسر کی کتاب ''فلسفۂ تعلیم''، بکل کی ''تاریخ التھذیب'' اور جرجی زیدان کی ''تاریخ التمدن الاسلامی'' بھی تھیں۔

کابل میں جب سیاسی طور پر حالات خراب ہوئے تو میں نے اُس زمانے میں الیاس برنی کی کتاب ''علم المعیشت'' اور ''ہندوستان کی معاشی حالت'' پڑھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میرے دل میں اشتراکی انقلاب کے مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چناں چہ میں نے اقتصادی نظریات میں گہرا غور و فکر کیا۔ اور میرا رُجحان سماجی بھلائی کے ریاستی نظام کی طرف ہوا۔ میں نے اس بات کو پسند کیا کہ میں اس نظریے کو ہندوستانی ذہنیت پر مرتب کرنے کی کوشش کروں۔

میرے رُفقا میں کچھ لوگ ایسے تھے، جنھیں اشتمالی اور اشتراکی انقلاب کے مطالعے میں مہارت حاصل تھی۔ میں ان کے ساتھ بہت سے مسائل میں بحث کرتا تھا۔ اور وہ میرے لیے اُن بہترین کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے، جو سوشل اِزم کے انتہا پسند اور معتدل لوگوں کے نظریات پر لکھی گئیں تھیں۔

جب ہم ماسکو پہنچے تو میرے رفقا میں سے ایسے مسلمان اور ہندو نوجوان جو ہندوستانی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، انقلابی کالج میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ یونیورسٹی میں جو کچھ پڑھتے تھے، اس پر ایک دوسرے سے روزانہ بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ ایک (ہندو) اگر وطنیت کی بنیاد پر بحث میں شریک ہوتا تو دوسرا (مسلمان) دین اور اسلام کے نظریے کو سامنے رکھ کر اس بحث میں شامل ہوتا۔

اس (تمام مطالعے، غور و فکر اور بحث و مباحثے) کے بعد میں نے ایسے فلسفۂ اجتماعیت کو اپنے لیے اختیار کرلیا، جو ہمارے امام، حکیم الہند، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفۂ سیاسیات کے ساتھ موافقت رکھتا تھا۔

فصل (3): امام ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی افکار

مکمل اور زیادہ فائدے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی اصل عبارت ذیل میں لکھ دیں۔

معاشی وسائل کی تقسیم پر حکومتی کنٹرول کی اہمیت:

حضرت الامام ''حجۃ اللہ'' کے ''أبواب إبتغاء الرزق'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''واعلم! أنه إذا اجتمع عشرة آلاف إنسان مثلاً في بلدة، فالسياسة المدنية تبحث

عن مكاسبهم، فإنهم إن كان أكثرهم مكتسبين بالصناعات و سياسة البلدة، والقليل منهم مكتسبين بالرعي والزراعة فسد حالهم فى الدنيا. وإن تكسبوا بعصارة الخمر و صناعة الأصنام كان ترغيبًا للناس فى إستعمالها على الوجه الذى شاع بينهم فكان سببًا لهلاكهم فى الدين. فإن وزعت المكاسب و أصحابها على الوجه المعروف الذى تعطيه الحكمة و قبض على أيدى المكتسبين بالأكساب القبيحة صلح حالهم." (13)

''جاننا چاہیے کہ جب کسی شہر کی آبادی دس ہزار کے قریب ہو جائے تو شہر کی سیاسی حکومت پر لازمی ہے کہ وہ لوگوں کے اختیار کردہ پیشوں کے بارے میں تحقیق وتفتیش کرے۔ چناں چہ اگر شہر کی اکثر آبادی محض سیاست میں حصہ لینے اور (تعیّشات پر مبنی) صنعت کاری کو اپنا پیشہ بنالے اور بہت تھوڑی آبادی زراعت اور اس سے متعلقہ شعبوں سے وابستہ رہ جائے تو دنیا میں اس کی سماجی حالت خراب ہوجائے گی۔ اور اگر وہ سماجی زندگی کے غیرضروری شعبوں سے دولت کمائیں۔ مثلاً شراب بنانے، صنم تراشی وغیرہ، تو اس سے لوگوں کو ایسی غیرضروری چیزوں کے استعمال کی ترغیب ہوگی۔ اور یہ چیزیں ان سب میں پھیل کر ان کی معاشی تباہی اور دینی ہلاکت کا سبب بنیں گی۔ اگر شہری حکومت تمام لوگوں کے معاشی پیشوں کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور حکمت و تدبر کے ساتھ ان میں معاشی پیشوں کی تقسیم کرے اور اس سلسلے میں عدل وانصاف کا طریقۂ کار اختیار کرے اور غلط پیشوں اور لوٹ کھسوٹ کے کام کرنے سے لوگوں کو روک دے تو ان کی سماجی حالت درست ہوجائے گی۔''

حکمران طبقے کی لوٹ کھسوٹ اور تعیّشات کی وجہ سے معاشی تباہی:

"وكذالك من مفاسد المدن أن ترغب عظمائهم فى دقائق الحلىّ والبناء والمطاعم وغيد النساء و نحو ذالك، زيادة على ماتعطيه الإرتفاقات الضرورية التى لابد للناس منها، واجتمع عليها عرب الناس وعجمهم فيكتسب الناس بالتصرف فى الأمور الطبيعية لتتأتى منها شهواتهم فينتصب قوم إلى تعليم الجوارى للغناء والرقص والحركات المناسبة اللذيذة، و آخرون إلى الألوان المطربة فى الثياب و تصوير صور الحيوان والأشجار العجيبة والتخاطيط الغريبة فيها، و آخرون إلى الصناعات البديعة فى الذهب والجواهر الرفيعة، و آخرون إلى الأبنية الشامخة وتخطيطها و تصويرها.

فإذا أقبل جم غفير منهم إلى هذه الأكساب أهملوا منها من الزراعات والتجارات. وإذا أنفق علماء المدينة فيها الأموال أهملوا مثلها من مصالح المدينة و جرذالك إلى التضييق على القائمين بالأكساب الضرورية كالزراع والتجار والصناع وتضاعف

الضرائب عليهم، و ذالک ضرر بهذه المدينة يتعدى من عضو منها إلى عضو حتى يعم الكل. و يتجارىٰ فيها كما يتجارى الكلب فى بدن المكلوب، وهذا شرح تضررهم فى الدنيا، و أما تضررهم بحسب الخروج إلى الكمال الأخروى فغنى عن البيان.''

''اسی طرح ملکی نظام کی خرابیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس ملک کے حکمران طبقات بلند وبالا عمارتوں کی تعمیر، کھانے پینے کی لذتوں اور سونا چاندی کے زیورات جمع کرنے، اور نرم و نازک عورتوں سے شادی رَچانے وغیرہ اُمور کی طرف بہت زیادہ مائل ہوجائیں۔ اور یہ چیزیں عرب وعجم کے متفقہ اور انسانیت کے لیے لازمی حیثیت رکھنے والے ضروری ارتفاقات کے دائرے سے باہر نکل جائیں۔ چناں چہ کچھ لوگ حکمران طبقے کی خواہشات اور تعیّشات پورا کرنے والے پیشوں سے وابستہ ہوجائیں۔ جب کہ بعض لوگ لڑکیوں کو گانے بجانے اور انھیں رقص وسرود کی محفلوں کی لذات دوبالا کرنے کے طور طریقے سکھلانے کو اپنا پیشہ بنالیں۔ اسی طرح دوسرے کچھ لوگ کپڑوں کی طرب انگیز رنگائی کے کاموں میں مصروف ہوجائیں۔ اور جانوروں اور عجیب وغریب درختوں کی تصویر سازی اور خطاطی کے لایعنی شعبوں میں مصروف ہوجائیں۔ اسی طرح کچھ لوگ سونے اور قیمتی جواہر کی تراش خراش کو اپنا پیشہ بنالیں۔ اور دوسرے کچھ لوگ بڑی بلند و بالا عمارتوں کو بنانے اور سجانے اور تصویری نقوش بنانے کو اپنا ذریعہ معاش بنالیں۔

اگر کسی سوسائٹی کے اکثر لوگ اس قسم کے مہمل اور بے کار پیشوں میں مشغول ہوجائیں اور سوسائٹی کے پیداواری شعبوں، مثلاً زراعت، تجارت وغیرہ کو چھوڑ دیں اور ملک کے حکمران اور سرمایہ دار طبقے فضول اشیا پر بڑی بڑی رقومات خرچ کرنے لگ جائیں تو اس قسم کے کام مملکت کی اجتماعی مصلحتوں کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ضروری پیشوں سے وابستہ لوگوں پر تنگی کی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت سے وابستہ لوگ انتہائی پریشان حالی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ حکمران طبقے کی جانب سے ان پر کئی گنا زیادہ ٹیکس مسلط کردیے جاتے ہیں۔ اس طرح قوم اور ملک کو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ مرض ایک سے دوسرے کو لگتا چلا جاتا ہے۔ اور پورے معاشرے میں یہ مرض سرایت کرجاتا ہے۔ جیسا کہ خارشی کتے کی بیماری بڑھتے بڑھتے پورے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ اور یہ تباہی و بربادی کی حالت تو دنیا میں ہوتی ہے۔ جہاں تک آخرت کے حوالے سے نقصان کا معاملہ ہے، وہ تو بیان سے باہر ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد؛ سرمایہ پرستی کے نظام کا خاتمہ:

''وكان هذا المرض قداستولى على مدن العجم فنفث الله فى قلب نبيه صلى الله

علیه وسلم أن یداوی هذا المرض بقطع مادته. فنظر رسول الله صلی الله علیه وسلم إلی مظان غالبیة لهذه الأشیاء کالقینات والحریر والقسی و بیع الذهب بالذهب متفاضلاً لأجل الصناعات أو طبقات أصنافه و نحو ذالک.''(14)

''اور جب عجمی ممالک میں یہ مرض مکمل طور پر پھیل گیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں یہ بات ڈالی کہ اس مرض کو جڑ سے اُکھاڑ کر انسانیت کا علاج کیا جائے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس قسم کے مسرفانہ تعیّشات پر مبنی اشیاء پر پڑی۔ جیسے کہ رقص وسرود کی محفلوں کی زینت بننے والی لڑکیوں، ریشم کے لباس وغیرہ پر آپؐ نے پابندی لگا دی۔ اور سونا چاندی کو کمی زیادتی کے ساتھ خرید و فروخت کرنے پر بھی پابندی لگا دی۔ تاکہ مینا کاری کے کاموں میں ان کا استعمال نہ ہوسکے۔ یا تعیّشات وغیرہ میں بروئے کار نہ آسکیں۔''

سرمایہ پرستانہ نظام کی غیش پسندی

اسی طرح ''باب إقامة الإرتفاقات'' میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

یاد رکھیے! کہ جب عجم اور روم کے لوگوں کو کئی صدیوں تک حکومت کا موقع ملا۔ آخر وہ دنیاوی لذتوں میں ڈوب گئے۔ آخرت کو فراموش کر دیا۔ ان پر شیطان غالب آ گیا۔ تو یہ لوگ دنیاوی زندگی کے اُمور میں غرق ہوگئے۔ کثرتِ دنیا پر فخر کرنے لگے۔ دنیا بھر کے حکما ان کے پاس جمع ہوگئے، جو دنیاوی زندگی کی عیش وطرب کی باتیں سوچ کر بتاتے۔ یہ لوگ اسی حالت پر کاربند ہوگئے۔ اور اس دنیاوی زندگی میں ایک دوسرے پر بڑھتے رہے۔ اور ایک دوسرے پر فخر جتاتے رہے۔ آخر یہاں تک نوبت جا پہنچی کہ ان کے سرداروں میں سے جو سردار ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کی پیٹی یا تاج پہنتا، اسے شرم دلاتے۔ یا اس کا بلند تر محل، آب زن، حمام اور باغات نہ ہوتے اور اس کے پاس عمدہ عمدہ گھوڑے اور خوب صورت غلام نہ ہوتے تو اس پر طعنہ زنی کرتے۔ اور کھانوں میں جسے وسعت حاصل نہ ہوتی اور جس کے پاس خوب صورت لباس نہ ہوتے تو اسے شرم دلاتے۔

حکمران طبقات کا کردار

غرض یہ ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر فضول ہے۔ دیکھیے! اپنے زمانے کے حکام اور بادشاہوں کی حالت سامنے ہے۔ ان کو دیکھ کر سابق بادشاہوں کی داستانیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمام تکلّفات اور ان کے اصول ان کی زندگی میں اس طرح جگہ پکڑ چکے تھے کہ اگر ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جاتا تو بھی نہ نکلتے اور اس کی وجہ سے ایسا سخت مرض پیدا ہوا کہ جو تمام شہروں اور آبادی

کے تمام اعضا میں سرایت کر گیا۔ اور ایسی شدید آفت برپا ہوئی کہ کوئی دیہاتی، شہری، امیر اور غریب اس آفت سے نہ بچا۔ ہر ایک پر یہ پُرتکلف زندگی چھا گئی۔ سب کے دامن ان میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اور سب کو ان تکلّفات نے گھائل کر دیا۔ اور یہ تکلّفات نہ ملنے کی صورت میں ان پر غم و حزن کی آندھیاں چل پڑیں، جن کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام عیاشیاں صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں کہ بہت سا مال خرچ کیا جائے۔

محنت کشوں پر ظالمانہ ٹیکس کا نفاذ اور اس کے اثرات

اور اس قدر زیادہ مال صرف اسی صورت میں ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ کسانوں، تاجروں اور دوسرے لوگوں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے جائیں اور ان پر سختی کی جائے۔ اور اگر لوگ یہ ٹیکس ادا نہ کریں تو انھیں مارا جائے اور انھیں سزائیں دی جائیں۔ اگر وہ اطاعت کریں تو انھیں گدھے اور بیل کی طرح بنا لیا جائے۔ جو آبپاشی کرنے، جوتنے اور اَناج کی کٹائی کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔ اور صرف اپنے کام میں لانے کے لیے ان کو کھانے پینے کے لیے کچھ دیا جاتا ہے۔ پھر ان کو مشقت و محنت سے ذرا بھر بھی آرام نہیں دیا جاتا۔ ان تکلّفات میں مبتلا ہو کر یہ لوگ اُخروی سعادت کی جانب بالکل توجہ نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اس قابل رہتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بڑی سلطنت میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہوتا جو اپنے دین کی فکر کرے۔

حکمران طبقوں کی لوٹ کھسوٹ اور نظام کی خرابی کے اَثرات

حکمران طبقات کے لیے یہ سب سامانِ تعیّشات صرف ان محنت کش لوگوں کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں جو کھانے پینے سے متعلقہ پیشوں، لباس اور عمارات سے متعلقہ کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان حکمران طبقوں نے پیدائشِ دولت کے بنیادی پیشوں (زراعت، تجارت اور صنعت) کے اُن اصولوں کو چھوڑ دیا، جن پر دنیا کے نظام کا دار و مدار ہے۔

اور عام لوگ انہی حکمران طبقوں کا طواف کرنے لگے۔ وہ اپنے حکمران طبقوں کی ان چیزوں میں نقل کرنے لگے۔ اگر عوام یہ نہ کریں تو مال و دولت میں سے کچھ حصہ نہ پائیں اور حکمران طبقے ان کی کوئی پروا نہ کریں۔ اس طرح "**جمهور الناس صار عيالاً على الخليفة يتكفّفون منه**" جمہورِ انسانیت حکمرانوں کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ وہ ان کے سامنے ہر وقت ہاتھ پھیلائے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ درجِ ذیل چند طبقات پر مشتمل ہیں:

(ا) کچھ طبقے اس حوالے سے حکمرانوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ وہ غازی اور مجاہد ہیں۔

(۲) اور کچھ اس حوالے سے مانگتے ہیں کہ وہ شہر کا نظام چلانے والے انتظامی افسران ہیں۔ جو حکمران طبقے کے بنائے ہوئے قوانین وقواعد کی تو پابندی کرتے ہیں۔لیکن ان کا مقصد انسانی ضروریات کو پورا کرنا نہیں ہوتا۔سوائے اس کے کہ وہ گزشتہ حکمرانوں کے (ظالمانہ) کردار کو زندہ رکھتے ہیں۔

(۳) اور کچھ لوگ اس بنیاد پر حکمرانوں سے مانگتے ہیں کہ وہ شعرا ہیں۔اور بادشاہوں کا کام انھیں انعام ومرتبے سے نوازنا ہوتا ہے۔

(۴) اور کچھ لوگ حکمرانوں کے سامنے اس لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ وہ درویش اور فقرا ہیں۔اور بادشاہ کے لیے یہ بڑے عیب کی بات ہے کہ ان کی حالت کی خبر گیری نہ کرے۔

پھر یہ تمام طبقے باہم دست بگریبان ہو کر ایک دوسرے کے لیے تنگی اور مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے دولت کمانے کا پیشہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہوں کے صحبت نشین ہیں۔اور ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اور ان سے بہت اچھے طریقے سے گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی خوشامد بہت اچھی طرح سے کرسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ دولت کمانے کی یہ فن کاری ایسے انداز میں آگے بڑھتی ہے کہ ان کے تمام افکار کی گہرائی اسی کے گرد گھومتی ہے۔اس طرح وہ اپنے اوقات کو حکمران طبقوں کی صحبت میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔ جب اس طرح کے کام کثرت سے ہونے لگیں تو پھر انسانوں میں ذلیل خصلتیں جڑ پکڑ جاتی ہیں۔اور وہ اعلیٰ اور عمدہ اخلاق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

حکومتی نظام کی خرابی کے اثرات معلوم کرنے کا طریقہ

اگر تم اس مرض کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو ایسی قوم کا مشاہدہ کرو، جن میں کوئی ریاستی نظام موجود نہ ہو۔اور وہ کھانے پینے کی لذتوں میں بڑی گہرائی کے ساتھ ڈوبے ہوئے نہ ہوں۔ایسی قوم میں تم دیکھو گے کہ ان کا نظام آزادی وحریت پر مبنی ہوتا ہے اور ان میں کوئی ایسے بھاری ٹیکسوں کا نظام نہیں ہوتا۔جن کے بوجھ سے ان کی کمر ٹوٹ رہی ہو۔ایسی قوم اپنے دینی اور قومی نظام کو قائم کرنے کے لیے مقتدر طبقات کے تسلط سے آزاد رہنے کی طاقت واستطاعت رکھتی ہے۔اور اسی طرح ایک دوسری قوم کی حالت کا مشاہدہ کرو کہ جس میں ریاستی ڈھانچہ اور نظام موجود ہو، ان کا ایک حکمران طبقہ ہو اور وہ عوام کو اپنے تابع بنا چکا ہو، اور ان پر اپنا تسلط جما چکا ہو۔

انبیا کرامؑ ظالمانہ سسٹم کو توڑنے کے لیے آتے ہیں

جب ایسی مصیبت زیادہ پھیل جاتی ہے۔اور یہ مرض بہت بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اور ملائکہ مقربین

ان حکمران طبقات پر ناراض ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ اس مرض کو جڑ سے کاٹ کر اس بیماری کا علاج کیا جائے۔ ایسے ہی حالات تھے، کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک اُمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ جن کا عجم اور روم کے ساتھ کچھ ربط اور ضبط نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ کبھی ان کی رسوم کے پابند ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو میزانِ عدل قرار دیا۔ جن کے ذریعے ان طریقوں کو معلوم کیا جاتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عجمیوں کی عادات کی مذمت بیان فرما دی۔ اور دنیا کی زندگی میں غرق ہوکر مطمئن ہوجانے کی قباحت اچھی طرح ظاہر کرادی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں القا فرمایا کہ وہ ان عادات کو حرام بتا دیں، جو اہل عجم کی عادت بن چکی ہیں۔ اور ان پر فخر جتاتے ہیں۔

مثلاً ریشم وسوت کا مخلوط لباس اور اَرغوانی لباس پہننا حرام کردیا۔ سونے چاندی کے برتنوں، سونے کے زیورات اور ایسے کپڑے کہ جن پر تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ اور مکانوں پر نقش ونگار حرام فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے طے فرمایا کہ اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کے ذریعے ان (عجمیوں اور رومیوں) کی سلطنتوں کو تباہ کردے اور آپؐ کے ذریعے ان کی سطوت کا خاتمہ کردے اور کسریٰ کو ہلاک کردے کہ اس کے بعد کوئی دوسرا کسریٰ نہ ہو۔ قیصر کو ہلاک کردے کہ اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہو۔'' انتھٰی (15)

فصل نمبر (4): انقلابی حکومت کے نظام کا مطالعہ

اس کے بعد میں نے اپنا زیادہ تر وقت انقلابی حکومت کے نظام کے مطالعے میں خرچ کرنا شروع کردیا۔ اور یہ متعین کرنے کی کوشش کی کہ ''انقلابی حکومت'' اور ''جمہوریت'' کے درمیان کیا فرق ہے۔ چناں چہ جو کچھ میں نے سمجھا، وہ یہ کہ انقلابی حکمت عملی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ رجعت پسندوں کی کثرت کے باوجود ان کی اطاعت و پیروی کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ بلکہ انقلابی جماعت وہ ہوتی ہے، جو باقی تمام جماعتوں پر اپنی ڈکٹیٹرشپ اور بالادستی لازمی طور پر منواتی ہے۔

خلفائے راشدین کی حکومت کی صحیح نوعیت

اس طرح انقلابِ اسلامی کی تکمیل کے زمانے میں خلفائے راشدین کی حکومت کی صحیح نوعیت متعین کرنا میرے لیے آسان ہوگیا۔ خلفائے راشدین کی حکومت نہ ایسی جمہوریت پر مبنی تھی کہ جس میں مسلمانوں کے زیر حکومت علاقوں میں رہنے والے تمام لوگوں سے رائے لی گئی ہو۔ اور نہ ہی ایسی ملوکیت اور آمریت پر مبنی تھی کہ جس میں حکمران اور اس کے خاندان کو مسلمانوں پر کسی قسم کا کوئی تسلط حاصل ہو۔ اس لیے کہ اس زمانے میں امیرالمؤمنین ''حزب اللہ'' کے افراد میں سے ہر فرد کے سامنے جواب دِہ ہوتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ لوگ اللہ کے

گھروں (مساجد) میں سے کسی ایک گھر (مسجد) میں جمع ہوں (تو امیر المؤمنین کو مسجد میں موجود ہر ایک فرد کے سوال کا جواب دینا ضروری ہوتا تھا۔)

اس طرح میرے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ (خلفائے راشدین کے زمانے میں) انقلابی جماعت کو صرف طاغوتی اور شیطانی جماعتوں پر ڈکٹیٹرشپ اور بالادستی حاصل تھی، لیکن ''حزب اللہ'' میں شامل تمام افراد کے درمیان باہمی طور پر مساوات قائم رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے کہ ان میں آزاد قبائلی زندگی سے قریب تر ہونے کی وجہ سے آزادیٔ وحریت کا جوہر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اور ابھی ان میں شہری زندگی کے تکلّفات اور ترقیات بھی پورے طور پر داخل نہیں ہوئے تھے۔ چناں چہ ان میں پارٹی کی سطح پر تمام افراد کے درمیان مساوات کا احساس آہستہ آہستہ پختہ ہوتا چلا گیا۔ خاص طور پر اس پہلو سے کہ تمام عرب قبائل اسلام میں داخل ہوگئے۔ اور یوں قومی امتیاز مساوات پر مبنی پارٹی تشخص میں تبدیل ہوتا گیا۔

پارٹی کی سطح پر مساوات کے تصور کی اساس؛ قانونِ قصاص

انسانی زندگی میں مساوات کا یہ احساس ان میں اس وجہ سے سرایت کرتا چلا گیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ''قصاص'' کا حکم نازل فرمایا تھا۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے جنگوں میں بہت زیادہ مبتلا ہونے کی وجہ سے قانونِ قصاص کو اپنے قومی عزت وشرف کا نشانِ امتیاز بنالیا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۲:۱۷۹) ''اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل مندو، تاکہ تم بچتے رہو۔''

حکیم الہند (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) نے ''قصاص'' کی تفسیر ''مساوات'' اور ''مماثلت'' سے کی ہے۔ چناں چہ آپ نے اپنی کتاب ''مسوّی'' کے ''باب أحكام الخلافة'' میں لکھا ہے:

''والأظهر عندی .. أن القصاص هو المساواة والمماثلة فی القود والدّيات.... حيٰوةً أی بقاءً .... ولولم تعتبر مماثلة .... لأدّی ذالک الی الشحناء والتظالم ولاختلف الناس فی قبول ذالک والإختلاف يفضی إلی الهلاک فی الدنيا والآخرة.'' إنتهٰی (16)

ترجمہ: ''میرے نزدیک زیادہ واضح بات یہ ہے کہ قتل اور دیات میں قصاص سے مراد مساوات اور مماثلت ہے .... حیٰوۃ سے مراد بقا ہے .... اگر مساوات اور مماثلت کا اعتبار نہ کیا جائے تو لوگوں کے درمیان باہمی بغض وعداوت اور ظلم بڑھ جائے گا۔ اور لوگ اس کے قبول کرنے میں آپس میں اختلاف کریں گے۔ اور ایسا اختلاف رکھنا دنیا اور آخرت میں ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔'' ختم شد

میرا کہنا یہ ہے کہ عقل مند لوگ جب سوسائٹی کی بقا کے لیے کام کرتے ہیں تو قتل کے بدلے میں مساوات قائم کرنے کی طرح سیاسیات کے میدان میں بھی انسانوں کے درمیان مساوات قائم رکھتے ہیں۔ اور دیات کے قانون کو

www.rahimia.org

سامنے رکھتے ہوئے اقتصادیات کے میدان میں بھی مساوات کا نظام قائم کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نظیر اور مثال کو دوسری نظیر اور مثال پر قیاس کریں تو کامیاب ہوں گے۔ اللہ ہی اس کی توفیق دینے والے ہیں۔

فصل نمبر (5): سوویت رہنماؤں سے ملاقات اور انقرہ آمد

پھر میں نے سوویت یونین کے حکومتی عہدے داروں سے بھی ملاقات کی۔ اور اجتماعیت کی حامل جماعتوں کے رہنماؤں کی ایک جماعت سے بھی میں ملا۔ اور مشرقی ممالک کے اہم مسائل پر میں نے ان سے بحث و گفتگو کی۔ اس طرح میں نے بعض معاملات میں ترکی اور افغانی حکومتوں کے اراکین سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ اور ایرانی حکومت کے بعض اراکین سے بھی ملا۔ اور ان سے باہمی دلچسپی کے اُمور پر گفتگو کی۔

مَیں ۱۳۴۱ھ (جولائی 1923ء) میں انقرہ (ترکی) پہنچا۔ اور وہاں میں نے چار ماہ کے قریب قیام کیا۔ اس دوران بعض انقلابی لیڈروں جیسے عصمت پاشا (وزیراعظم ترکی) اور رؤف بک وغیرہ سے مَیں نے ملاقات کی۔ بعض مصری علما کو بھی وہاں دیکھا۔ ان میں سے شیخ عبدالعزیز جاویش بھی تھے۔

اگر میں نے روس کے نظام کا اچھی طرح مطالعہ نہ کیا ہوتا تو میں ترکی میں پیدا ہونے والے سماجی تغیرات کو پورے طور پر سمجھنے پر قادر نہ ہوتا۔ جب کہ ہمارے جو اکابر ہندوستان میں ہیں، ان کو میں نے اس سلسلے میں حیران و پریشان پایا۔

باب (7) استنبول میں قیام

فصل (1): استنبول آمد اور ''ترکی'' کی تاریخ کا تجزیہ

پھر میں (آخر اکتوبر 1933ء میں) استنبول آیا۔ اور وہاں میں تقریباً تین سال رہا۔ اس دوران خلافتِ عثمانیہ کی تاریخ کے مطالعے میں مشغول رہا۔ خاص طور پر سلطان عبدالعزیز خان شہید کے زمانے (1861ء تا 1876ء) سے اتحادِ اسلام کی تحریک سے متعلق ابتدائی اُمور کا میں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔

ہمارے دیوبندی مشائخ نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد حجاز مقدس میں پناہ لی تھی۔ اور اسے اپنے کاموں کے لیے مرکز بنا لیا تھا۔ ان حضرات کا حکومتِ استنبول سے بہت تھوڑا تعلق باقی رہ گیا تھا۔ میں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اس سلسلے میں بہت سی روایات اور حکایات سنی تھیں۔ پھر بعد میں ہم نے اس کا اثر دارالعلوم سے شائع ہونے والے رسائل میں نہیں دیکھا۔ مجھے ہمیشہ سے یہ شوق رہا کہ معاملات کا

www.rahimia.org

گہرائی میں جا کر جائزہ لوں، تا کہ باہم برسرِ پیکار جماعتوں کے دعوؤں کے ذیل میں چھپی حقیقت کا سراغ لگایا جا سکے۔

ترکوں اور عربوں کا باہمی اختلاف اور جمال الدین افغانی کا کردار

مجھے اس وقت بڑا افسوس ہوا، جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوئی کہ عربوں اور ترکوں کے درمیان باہمی اختلاف اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس میں خیر کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ پھر اس وقت میں مجھے مزید جھٹکا لگا، جب میرے سامنے یہ حقیقت کھلی کہ سید جمال الدین افغانی ''خلافتِ عثمانیہ'' کے خاتمے کی بنیاد پر ''خلافتِ عربیہ'' قائم کرنے کے بڑے داعیوں میں سے ایک تھے۔ نیز جب مجھ پر یہ واضح ہوا کہ برطانوی لیڈروں کی نظر میں مشرقی مسئلے کی کچھ حیثیت نہیں ہے۔ اور میں نے ان کے اس سلسلے سے متعلق اشاروں اور کنایوں کو بڑی اچھی طرح سمجھا۔

مسلمان معاشروں کے فرسودہ طبقات

میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ خلافتِ عثمانیہ میں ''جمہوریت'' اور ''قومی آزادی'' کے نام پر مسلمانوں کو اپنے سیاسی ارتقا کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ کابل میں مدحت پاشا کے بیٹے علی حیدر کی لکھی ہوئی اس کی سوانح عمری اور مصری لیڈر فرید بک کی کتاب ''تاریخ دولتِ عثمانیہ'' پڑھنے کے بعد ''جمعیت اتحاد و ترقی'' کے ارتقا اور پھیلاؤ کے بارے میں مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ چناں چہ عصری تعلیم کے بانی ہندوستانی لیڈر سر سید احمد خان کے نظریات و خیالات اور عثمانی لیڈر صدر اعظم مدحت پاشا (1822ء تا 1884ء) کی زندگی میں مَیں کوئی خاص فرق تلاش نہ کر سکا۔

میرا یہ بھی تجزیہ ہے کہ مسلمان معاشروں میں جو کچھ اجتماعی طاقت باقی ہے، وہ بادشاہوں کی وراثت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس سے میری مراد وہ طبقات ہیں جن میں کچھ تو عیاش اور مفاد پرست حکمران طبقات اور مال دار جماعتیں ہیں، اور کچھ ان کے مفادات کی حفاظت کرنے کے لیے گم راہ کرنے والے علما اور حیلہ ساز انقلابی لیڈر ہیں، جن میں دورِ حاضر کی سیاست کی سمجھ بوجھ اور اس کا مزاج قطعاً موجود نہیں ہے۔ چناں چہ میرا تجزیہ ہے کہ:

1۔ بادشاہوں کی وراثت پر مبنی اس زوال پذیر قوت پر اعتماد کرنا

2۔ ''دین'' اور ''قوم'' کے نام پر اس کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

3۔ ''جمہوریت'' یا ''بادشاہت'' کے عنوان سے ان میں سے کسی خاندان کی حکومت قائم کرنا۔

4۔ ان میں سے کسی ایک آدمی کو ملتِ اسلامیہ کے کمانے والے طبقات پر زبردستی حکمران بنانا۔

5۔ ملتِ اسلامیہ کی اصلاح اور ترقی کو ان کی اصلاح اور ترقی سے وابستہ کرنا۔

اپنے آپ کو دھوکہ دینے اور جہالت کو قبول کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

www.rahimia.org

انقلابی اصولوں پر کام کرنے میں ہی نجات ہے

چناں چہ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ انقلابی اصولوں کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیں۔ اور یہ کام بے شک فوری نہ ہوسکے، بلکہ ہر ایک ملک میں جدوجہد کی نوعیت اور اس کے درجات میں فرق کی وجہ سے اگرچہ کچھ زمانے کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن نجات کا واحد راستہ انقلابی اصولوں کے اپنانے میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اہل علم علما میں سے سوائے حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے اور کوئی ایسا عالم نہیں ہے کہ جس کی پیروی اس جیسے عظیم کام کے سرانجام دینے کے سلسلے میں کی جائے۔

فصل (2): انقلابی پروگرام کی ترتیب اور اس کی اشاعت

اس تجزیے کے بعد میرے لیے یہ آسان ہوگیا کہ ہندوستانی انقلابی جماعت کے نام سے ایک ''سوراجی'' (عوامی) سیاسی پروگرام مرتب کرسکوں۔ ہمارے نزدیک ہندوستان کی حکومت جمہوریت کے سوا کسی اور نظریے پر قائم نہیں ہونی چاہیے، جب کہ یہ جمہوری حکومت بھی عدمِ مرکزیت کے اصول پر کام کرے۔ اس لیے کہ پورا ہندوستان ایک ملک نہیں ہے، بلکہ وہ یورپ کی طرح ایک ایسے خطے کا نام ہے، جو کئی ممالک کا مجموعہ ہے۔ اور جس میں لسانی اور تہذیبی شناختیں رکھنے والی بہت سی اقوام رہتی ہیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایسا نیا اجتماعی اور اقتصادی نظام تشکیل دیا جائے، جس میں:

1۔ معاشی معاملات سود سے قطعاً پاک ہونے چاہئیں۔

2۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ زمینوں کو افراد کی ملکیت کے بجائے اقوام کے لیے وقف کردیا جائے۔

اس طرح یہ ممکن ہوگا کہ اس پروگرام کی مشرقی ممالک، خاص طور پر مسلمان ملکوں کے ساتھ مطابقت پیدا ہوجائے۔

فصل (3): زمینوں کو وقف کرنے کے دلائل

زمینوں کو وقف کردینے کے حوالے سے ہم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد امیرالمؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ کے قول پر ہے۔ تمام صحابہ نے اس پر اجماع کیا ہے۔ ہم یہاں امام ولی اللہ دہلویؒ کی تحریر کے متعلقہ حصے تفصیلی طور پر درج کرتے ہیں تاکہ اہل علم حضرات کو اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے افکار سے پوری آگاہی ہوسکے۔ اور یہ معاملہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم (کی اکثریت) پر کسی طرح بھی شک وشبہ کا سبب نہ بنے۔

زمینوں کے سلسلے میں خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کا فیصلہ

امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء'' میں حضرت عمر فاروقؓ کے فقہی

اجتہادات پر مبنی ایک کتاب، ''فقہِ عمر'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کے ''باب قسمة الفیء'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ہمارے بعض مشائخ نے روایت کیا ہے، اور انھوں نے یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جب عراق فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک خط لکھا، جس میں تحریر تھا:

''اما بعد! فقد بلغنی کتابک تذکر أن الناس سئلوک أن تقسم بینهم مغانمهم ممّا أفاء اللّٰه علیهم. فإذا أتاک کتابی هذا، فانظر ما جلب الناس به علیک إلی العسکر من کراع أو مال فاقسمه بین من حضر من المسلمین، واترک الأرضین والأنهار لعمّالها لیکون ذالک من أعطیات المسلمین فإنک إن قسّمتها بین من حضر لم یکن لمن بعدهم شیء.'' (17)

ترجمہ: ''امابعد! آپ کا خط مجھے ملا، جس میں آپ نے تذکرہ کیا ہے کہ لوگ آپ سے اس مالِ غنیمت اور زمینوں کی تقسیم کا مطالبہ کرتے ہیں، جو اللہ نے انھیں دیا ہے۔ جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو یہ دیکھو کہ جو منقولہ اشیا اور جانور تمہارے پاس لشکر میں جمع ہوگئے ہیں، انھیں مسلمان حاضرین میں تقسیم کردو جب کہ زمینوں، نہروں اور دریاؤں کو کاشت کاروں کے لیے چھوڑ دو۔ تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے مستقل عطیات میں سے بن جائیں۔ کیوں کہ اگر تم نے انھیں حاضرین میں تقسیم کردیا تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔''

زمینوں کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے مدینہ منورہ کے علما میں سے ایک سے زائد لوگوں نے روایت کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جب حضرت عمر ابن الخطابؓ کے سامنے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی جانب سے بھیجا ہوا عراقی لشکر آیا تو حضرت عمرؓ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے عطیات تقسیم کرنے کے رجسٹروں میں افراد کے اندراج پر مشورہ کیا۔ اور اس سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس رائے کی اتباع کیا کرتے تھے کہ جس میں تمام لوگوں کے لیے مساوات کی بنیاد پر مال تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن جب عراق کی فتح ہوئی تو لوگوں نے اس سلسلے میں مشورہ کیا کہ کیوں نہ زیادہ خدمات سرانجام دینے والوں کو عطیات میں سے کچھ زائد حصہ دیا جائے۔ چناں چہ آپ نے دیکھا کہ عام لوگوں کی رائے یہی ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے بھی اسی رائے پر فیصلہ کردیا۔ اور پھر یہی رائے ہوگئی۔

پھر صحابہ کرامؓ نے عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کے بارے میں بھی مشاورت کی۔ پس ایک قوم نے اس سلسلے میں گفتگو کی اور ان کی رائے یہ تھی کہ مجاہدین کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے یہ زمینیں اور تمام مفتوحہ

www.rahnuma.org

چیزیں ان میں تقسیم کردی جائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''اس صورت میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے کیا بچے گا؟ جب وہ یہ دیکھیں گے کہ زمین اور اس پر کام کرنے والے تمام لوگ پہلے سے ہی تقسیم کر دیے گئے ہیں۔ اور یہ زمینیں آبائی ترکے کی طرح لوگوں کی وراثت قرار دے دی گئی۔ لہٰذا میری رائے یہ نہیں ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے اُن سے کہا: ''پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ زمین اور اس کی متعلقہ چیزیں اللہ کی طرف سے مالِ غنیمت نہیں ہیں؟''

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''بات ایسے ہی ہے جیسے تم کہتے ہو، لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ اللہ کی قسم میرے بعد کوئی شہر فتح نہیں ہوگا کہ جس میں بہت زیادہ زمین اور مال و دولت حاصل ہو بلکہ اندازہ یہ ہے کہ آئندہ جو ممالک فتح ہوں گے وہ مسلمانوں پر بوجھ ہوں گے۔ اگر عراق اور شام کی زمینیں اپنے تمام متعلقہ لوگوں کے ساتھ تقسیم کردی جائیں تو پھر سرحدوں کی حفاظت کا فوجی نظام کیسے قائم ہوگا؟ اور آئندہ فتح ہونے والے شہروں میں بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کا نظام اس کے بغیر کیسے ہوگا؟''

اس پر شام اور عراق کے لوگ حضرت عمرؓ کے پیچھے پڑ گئے۔ اور انھیں کہنے لگے کہ وہ زمینیں جنھیں ہماری تلواروں کی وجہ سے اللہ نے بطورِ مالِ غنیمت کے ہمیں دیا ہے، ایسی قوم پر وقف نہ کرو جو خود یہاں حاضر نہیں۔ اور جو نہ خود میدان میں نکلے اور نہ ان کی اولاد یہاں موجود ہے۔ اس لیے ان کے لیے وقف نہ کرو۔

حضرت عمرؓ اپنی رائے پر جمے رہے۔ اور انھوں نے اس سے زیادہ کوئی بات نہیں فرمائی کہ: ''بہرحال میری یہ رائے نہیں ہے۔'' لوگوں نے کہا کہ: ''پھر آپ صحابہؓ سے مشورہ کریں۔'' چناں چہ حضرت عمرؓ نے مہاجرین اولین سے مشورہ کیا۔ تو ان میں بھی اختلاف ہوگیا۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کی رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کردیا جائے، جب کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کی رائے وہ تھی جو حضرت عمرؓ کی رائے تھی۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دس انصاری صحابہؓ کو پیغام دے کر اپنے پاس بلوا بھیجا۔ جن میں سے پانچ قبیلہ اوس کے تھے اور پانچ قبیلہ خزرج کے تھے۔ اس طرح آپ نے ان کے بڑے بڑے رہنماؤں اور معززین کو مشاورت کے لیے بلایا۔

زمینوں کو وقف کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے دلائل

جب تمام صحابہ جمع ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ:

"إنی لم أزعجکم إلا لأن تشرکوا فی أمانتی فیما حُمّلت من أمورکم، فإنی واحد کأحدکم، وأنتم الیوم تُقرّون بالحق، خالفنی من خالفنی ووافقنی من وافقنی و لست أرید أن تتبعوا الذی هو هوایَ. معکم من اللّٰه کتاب ینطق بالحق فواللّٰه لئن کنت نطقت بأمر أریده ما أردت به إلا الحق."

''میں نے تم کو اس لیے بلوایا ہے کہ تم لوگ میری اس امانت میں شریک ہو، جو تمہارے امور کی انجام دہی کے لیے میرے سپرد کی گئی ہے۔ میں تمہارے میں سے ہی ایک آدمی کی طرح کا ایک فرد ہوں۔ آج کے دن تم حق پر قائم رہو۔ جو میری مخالفت کرنا چاہے، وہ کھل کر مخالفت کرے۔ اور جو میری موافقت کرنا چاہے تو کھل کر موافقت کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کی اتباع اور پیروی کرو۔ تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے، جو حق کے اصولوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اللہ کی قسم اگر میں اپنی زبان سے ایسی بات کہوں کہ جس سے میرا ارادہ کچھ اور ہو۔ ایسا نہیں، بلکہ میرا ارادہ سوائے حق کے اور کچھ نہیں۔''

تمام نے کہا کہ: ''اے امیر المؤمنین ہم آپ کی بات اچھی طرح سنیں گے۔''

اس پر حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا:

''قد سمعتم كلام هؤلآء القوم الذين زعموا إني أظلمهم حقوقهم، و إني أعوذ بالله أن أركب ظلمًا. لئن كنت ظلمتهم شيئًا هُو لَهم وأعطيته غيرهم لقد شقيت، و لكن رأيت أنه لم يبق شيء يُفتح بعد أرض كسرىٰ. و قد غنمنا الله أموالهم وأرضهم و علوجهم فقسّمتُ ماغنموا من مال أُورّثُه بين أهله وأخرجتُ الخُمس فوجهته على وجهه وانا في توجيهه.

ورأيت أن أحبس الأرضين بعلوجها وأضعُ عليهم فيها الخراج وفي رقابهم الجزية يؤدونها فيكون شيئًا للمسلمن للمقاتلة والذرية ولمن يأتي بعدهم. أرأيتم هذه الثغور بُدٌّ لها من رجالٍ يلزمونها؟ أرأيتم هذه المدن العظام والشام و الجزيرة والكوفة والبصرة ومصر بُدٌّ من أن تُشحَن بالجيوش وإدرار العطاء عليهم. فمن أين يعطى هؤلآء إذا قسمت الأرضين والعلوج.''

''تم نے ان لوگوں کی بات سن لی ہوگی، جن کا یہ خیال ہے کہ میں ان کے حقوق پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کو جائز سمجھوں۔ اگر میں ان پر کسی ایسی چیز کے بارے میں ظلم کرتا جو ان کی ہو، اور وہ ان کے علاوہ کسی اور کو عطا کروں تو بے شک میں بدبخت ہوں۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسریٰ کی زمین کے فتح ہونے کے بعد اب کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ اور اللہ نے ہمیں ان کا مال، ان کی زمین اور ان کے متعلقہ چیزیں بطورِ مالِ غنیمت کے عطا کی ہیں۔ پس جو مال بھی مجھے ملا، میں نے اُسے تقسیم کر دیا۔ اور ان کو اس کا وارث بنا دیا۔ البتہ میں نے اس کا خُمس لے لیا۔ اور میں نے اس کو مصارف کے مطابق خرچ کر دیا۔ اور ابھی تک میں اسی کو درست کرنے میں لگا ہوا ہوں۔

اس کے بعد میں نے یہ دیکھا کہ زمینوں کو کاشت کاروں سمیت روک لوں۔ اور ان پر خراج اور ٹیکس

لگا دوں اور ان لوگوں پر اتنا جزیہ لگا دوں، جو وہ آسانی سے ادا کر سکیں۔ اس طرح یہ مسلمانوں کے لیے ایک مستقل ذریعۂ آمدنی ہو جائے گا۔ جو تمام مسلمانوں کی اولاد اور مجاہدین کے لیے ہوگا۔ اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے بھی ہوگا۔ کیا تم ان سرحدوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے لیے مردوں کی ایک فوج کی ضرورت ہے، جو ہر وقت اس کی حفاظت کرے۔ کیا تم ان بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کو نہیں دیکھتے، جیسے شام، الجزائر، کوفہ، بصرہ، مصر وغیرہ کہ جن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لشکروں کی ضرورت ہے۔ اور وہاں کے لوگوں میں مال تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر میں یہ زمینیں اور ان کی متعلقہ چیزیں ان میں تقسیم کر دوں تو پھر ان تمام کے لیے میں کہاں سے مال لاؤں گا؟''

صحابہ کرامؓ کا متفقہ فیصلہ

حضرت عمرؓ کے دلائل سن کر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اَجمعین نے کہا کہ:

''ہماری رائے وہی ہے جو آپ کی رائے ہے۔ آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ اور بہت اچھی رائے دی۔ واقعی اگر فوجوں کے ذریعے سے ان سرحدوں کی حفاظت نہ کی گئی۔ اور ان شہروں میں فوجوں کو بھیجا نہ گیا۔ اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مال نہ بھیجا گیا کہ جس سے وہ قوت حاصل کریں۔ تو یہ سارے شہر اہل کفر کی طرف لوٹ جائیں گے۔''

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''اب میرے لیے معاملہ پوری طرح واضح ہو گیا۔'' (18)

حضرت عمرؓ کی بات نہ ماننے والوں پر اِبتلا

حضرت امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ: ''مجھ سے لیث ابن سعد نے روایت کیا ہے، اور ان سے حبیب ابن ابی ثابت نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ اور مسلمانوں کی جماعت نے حضرت عمر بن خطابؓ سے شام کی زمین تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمین تقسیم کی تھی۔ اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ سختی سے مطالبہ کرنے والے حضرت زبیر بن العوامؓ اور بلال بن ابی رباحؓ تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''کیا پھر میں تمہارے بعد آنے والے مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کے لیے کچھ بھی نہ باقی بچے؟'' پھر اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہ دعا فرمائی: ''اے اللہ! بلال اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے پر تو میرے لیے کافی ہو جا۔'' حبیب بن ابی ثابت کا کہنا ہے کہ: ''ان پر عمواس میں جو طاعون پڑا تھا وہ حضرت عمرؓ کی اس دعا کا نتیجہ تھا۔''

حضرت عمرؓ کا اپنی رائے کے لیے قرآن حکیم سے استدلال

حضرت امام ابی یوسف فرماتے ہیں کہ: ''مجھ سے محمد ابن اسحاقؒ نے روایت کیا ہے اور ان سے امام زہری نے

روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے عراق کی زمینوں کے فتح ہونے کے بعد لوگوں سے ان کے بارے میں مشورہ کیا۔ پس عام لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور بلال بن ابی رباحؓ ان سب میں زیادہ سختی سے مطالبہ کر رہے تھے۔ جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ زمینوں کو تقسیم نہ کیا جائے۔ اور انھیں اسی طرح رہنے دیا جائے۔ پھر آپ نے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! بلال کے مقابلے پر میرے لیے کافی ہو جا۔ لوگ اس سلسلے میں دو تین دن تک آپس میں جھگڑتے رہے۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''مجھے اپنی رائے کی دلیل مل گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں (سورۃ الحشر میں) ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ آیت تلاوت کی:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۶:۵۹)

(اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے مفت دلا دیا۔ سو تم نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ اپنے رسول کو غالب کر دیتا ہے، جس پر چاہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔)

حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھنے کے بعد فرمایا کہ: ''یہاں تک اللہ نے بنی نضیر کی مفتوحہ زمین کے بارے میں حکم بیان کیا ہے۔ اور یہ حکم تمام بستیوں کے لیے عام ہے۔''

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اگلی آیت پڑھی:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۷:۵۹)

(اور جو مال اللہ نے اپنے رسول کو دیہات والوں سے مفت دلایا۔ سو وہ اللہ اور رسول اور قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے دولت مندوں میں نہ پھرتا رہے۔ اور جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو۔ اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اگلی آیت پڑھی:

لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ ۝ (۸:۵۹)

(وہ مال وطن چھوڑنے والے مفلسوں کے لیے بھی ہے، جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا مندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی سچے

(مسلمان) ہیں۔)

پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''اللہ راضی نہیں ہوا یہاں تک کہ ان کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر دیا۔ چناں چہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۹:۵۹)

(اور وہ مال ان کے لیے بھی ہے کہ جنھوں نے ان سے پہلے مدینے میں گھر اور ایمان حاصل کر رکھا ہے۔ جو ان کے پاس وطن چھوڑ کر آتا ہے۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اپنے سینوں میں اس کی نسبت کوئی خلش نہیں پاتے کہ مہاجرین کو دیا جائے۔ تو وہ دوسروں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر چہ خود ان پر فاقہ ہو۔ اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچایا جائے، پس وہی لوگ کامیاب ہیں۔)

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اس آیت میں بیان کردہ یہ حکم انصار کے لیے خاص ہے۔ یہ وہ بات ہے جو ہم تک پہنچی ہے اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے۔ پھر اللہ نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کیا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۱۰:۵۹)

(اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو مہاجرین و انصار کے بعد آئے۔ اور وہ دعا مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے اُن بھائیوں کو بخش دے، جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں ایمان داروں کی طرف سے کینہ قائم نہ ہونے پائے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''یہ بعد میں آنے والے تمام لوگوں کے لیے عام حکم ہے۔ پس یہ مالِ غنیمت ان تمام لوگوں کا حصہ ہے۔ اب ہم اس کو ان لوگوں پر تقسیم کر دیں اور بعد والوں کو بغیر تقسیم کے چھوڑ دیں؟''

پس تمام صحابہ کرامؓ کا ان زمینوں کے وقف کرنے اور ان پر خراج اور ٹیکس لگانے پر اجماع ہو گیا۔ (19)

زمینوں کو وقف کرنے کے سلسلے میں حضرت امام قاضی ابو یوسفؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا:

''زمینوں کو فاتحین میں تقسیم نہ کرنے کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ایسی رائے قائم کرنا اور اللہ کی کتاب میں سے اس کی دلیل کو پیش نظر رکھنا، یہ اللہ کی جانب سے ان کو بڑی توفیق دی گئی۔ اس میں تمام

مسلمانوں کے لیے بڑی بھلائی ہے۔ اور جو حضرت عمرؓ نے ٹیکس جمع کرنے کے بارے میں رائے قائم کی تھی۔ اور اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، یہ بھی مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے لیے عمومی نفع کا سبب بنا۔ اس لیے کہ اگر یہ زمینیں لوگوں کو عطیات دینے اور ان کے کھانے پینے کے بندوبست کے لیے وقف نہ کی جاتیں تو سرحدوں کی حفاظت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اور نہ ہی جہاد کے لیے لشکروں کی تیاری کرنا ممکن ہوتا۔ اور جب جہاد کرنے والے لوگوں سے شہر خالی ہوجاتے اور ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہوتا تو کافروں کو اپنے شہروں کی طرف لوٹنے سے روکنا ممکن نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ خیر کے کاموں کو زیادہ جانتا ہے، جو وہ کرتا ہے۔''

زمین کو وقف کرنے کے سلسلے میں امام شافعیؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ:

''وہ گھر اور زمینیں جو باہمی صلح سے حاصل کیے جائیں، وہ مسلمانوں کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ ہر سال اس کی آمدنی جمع کی جائے گی۔ اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ اہل شرک کے چھوڑے ہوئے تمام شہر اسی طرح کے تھے۔ البتہ کچھ زمینیں ایسی تھیں، جس میں حضرت عمرؓ نے اُن لوگوں کی رضامندی چاہی، جنھوں نے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر یعنی جنگ کے ذریعے اسے فتح کیا تھا، تو لوگوں نے ان زمینوں پر سے بھی اپنے حقوق کو چھوڑ دیا۔ جیسا کہ رسول اللہؐ نے قبیلہ بنی ہوازن کے قیدیوں کے سلسلے میں لوگوں کی رضامندی حاصل کی تھی، تو انھوں نے بھی اپنے حقوق کو چھوڑ دیا تھا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جریر بن عبداللہ کی حدیث میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو ان کے حق کا بدلہ دے دیا تھا۔ جریر کے اس قول کے مشابہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے، جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ: ''**لولا إني قاسم مسئول لترکتم علی ما قسم لکم**'' (اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں ایسا تقسیم کرنے والا ہوں، جس سے بازپُرس بھی ہوگی۔ تو میں تم کو اس تقسیم کے مطابق چھوڑ دیتا جو تمہارے لیے (خیبر میں) تقسیم کیا جاچکا ہے۔ حضرت جریر کا کہنا ہے کہ (خیبر میں) صلح والے شہروں کو جنگ کے ذریعے حاصل کردہ شہروں کے ساتھ ملا کر تقسیم کردیا گیا تھا۔ پس حضرت عمرؓ نے صلح سے قبضہ کیے ہوئے علاقوں کو تو الگ کر لیا۔ اور جن شہروں کو گھوڑے دوڑا کر جنگوں سے حاصل کیا گیا تھا، اس کا معاوضہ ادا کردیا۔''

زمینوں کے وقف کے سلسلے میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مفصل رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

''ایرانیوں اور رومیوں نے زمینوں کے مالکوں پر زبردستی قبضہ کیا ہوا تھا۔ وہ ان سے ٹیکس لیتے تھے۔ جب کہ یہ ایرانی اور رومی ان زمینوں اور کاشت کاروں کے خود مالک نہ تھے۔ اور نہ ان کے آباؤاجداد میں اس کی وراثت چلی آتی تھی۔ مسلمانوں نے آکر ان زبردستی قبضہ رکھنے والے ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ لڑائی کی۔ اور ان کو شام اور عراق کی زمینوں سے دور دھکیل دیا۔ جہاں تک زمین کے مالکان اور کاشت کاروں کا تعلق ہے تو وہ اپنی زمینوں کو کاشت کرتے تھے اور اس پر رہائش پذیر تھے۔ اور وہ اپنے آباؤاجداد سے وراثت کے طور پر چلے آرہے تھے۔ ان کی اکثریت نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کرلی اور خراج دینا اپنے اوپر لازم قرار دے دیا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے رومیوں اور فارسیوں کی مدد کی بھی تھی۔ اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑائی بھی کی تھی۔ اس طرح لوگوں پر ان کا معاملہ مشتبہ ہوگیا۔ عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ زمینیں اس لیے مالِ غنیمت ہیں کہ مالکانِ اراضی میں سے کچھ لوگ لڑنے والوں میں شامل تھے۔ جب کہ خاص لوگوں نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اصل میں جن سے لڑائی لڑی گئی تھی، وہ تو ان زمینوں پر زبردستی کے ساتھ مسلط تھے۔

جہاں تک زمین میں رہائش رکھنے والے مالکان کا تعلق ہے، تو ان کی اکثریت نے مسلمانوں سے صلح کرلی۔ اس طرح مسلمانوں نے بغیر جنگ کیے صلح کے ذریعے سے یہ زمینیں فتح کی تھیں۔ انھوں نے جو لڑائی لڑی تھی، وہ تو دوسرے ظالم لوگوں سے ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اس مسئلے میں مالِ فئی والی آیت تلاوت کی تھی۔ البتہ بہت تھوڑے لوگ وہ تھے، جنھوں نے ایرانیوں اور رومیوں کے لشکر کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑائی لڑی تھی۔ تو ان کی زمینیں مالِ غنیمت ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو وقف کرتے ہوئے مجاہدین سے رضامندی حاصل کی تھی۔ جو راضی نہیں ہوا تھا، اسے معاوضہ ادا کردیا تھا۔''

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

''اور اگر معاملہ اس طرح ہوا ہو، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے۔ تو عراق اور شام کی زمینوں کا معاملہ مالِ غنیمت کے طریقوں سے دوسرے اصول کی طرف ہٹا دیا گیا۔ اور اسے اجماعِ صحابہؓ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ (۸:۴۱) کے عام حکم سے خاص کردیا گیا ہے۔ اور جو کچھ صحابہؓ نے نبی اکرمؐ کی حدیث سے سمجھا اور جو فارس اور روم کی فتح کے سلسلے میں آپ کی گفتگو کا تقاضا تھا۔

شام اور عراق کے علاوہ جتنے بھی شہر ہیں تو بقول امام شافعیؒ، ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ شہر جو اللہ نے بغیر گھوڑے دوڑائے اور جنگ کیے مفت میں عطا کیے ہیں۔ یہ شہر غازیوں

کے لیے خزانہ بنائے گئے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف خیبر کے ساتھ کیا تھا۔ جو بغیر جنگ کے حاصل ہوا تھا۔ اور جیسا کہ آپؐ نے بنونضیر کی زمینوں اور باغِ فدک کے بارے میں کیا تھا۔

دوسرے وہ شہر ہیں جو جنگ کے ذریعے سے حاصل کیے گئے۔ تو انھیں لوگوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہؐ نے خیبر کے اس نصف کے بارے میں کیا تھا جو جنگ کے ذریعے سے حاصل کیا گیا تھا۔''

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

''ہماری اس تحقیق پر ان روایات کا ظاہر دلالت کرتا ہے، جنھیں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے۔ اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر بعد میں آنے والے مسلمان نہ ہوتے تو کوئی شہر فتح نہ ہوتا، مگر میں اس کو اسی طرح تقسیم کرتا، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کیا۔ اور امام شافعیؒ جریر بن عبداللہ سے تعلیقاً روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''**لولا إني قاسم مسئول لتركتم على ما قسم لكم**'' (اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں ایسا تقسیم کرنے والا ہوں، جس سے بازپرس بھی ہوگی۔ تو میں تم کو اس تقسیم کے مطابق چھوڑ دیتا جو تمہارے لیے (خیبر میں) تقسیم کیا جاچکا ہے۔) تو اس روایت سے اس کا ایسی زمینوں پر محمول ہونا متعین ہوجاتا ہے، جو جنگ سے فتح ہوئی ہوں، کیوں کہ رسول اللہؐ نے وہی زمینیں ان میں تقسیم کی تھیں، جو جنگ سے فتح ہوئی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ اور جمہورِ صحابہؓ کے سامنے ایک ایسی مصلحت آئی، جس کا تقاضا تھا کہ جنگ سے مفتوحہ زمینوں کی بھی تقسیم نہ کی جائے۔ اور انھیں غازیوں اور سامانِ جہاد وغیرہ تیاریوں کے لیے خزانہ بنالیا جائے۔'' انتھٰی (20)

زمینوں کے وقف کے سلسلے میں امام شاہ عبدالعزیزؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے فرمایا کہ:

''شیخ جلال الدین تھانیسریؒ نے ہندوستان کی تمام زمینوں کے بارے میں یہ حکم لگایا ہے کہ یہ سب وقف ہیں۔ جیسا کہ عراق کی زمینیں وقف ہیں۔'' (21)

فصل (4): انقلابی پروگرام کے تقاضے

استنبول میں قیام کے دوران مجھے اس کا موقع ملا کہ میں اپنے انقلابی پروگرام کے اصولوں پر مشرقی ممالک سے تعلق رکھنے والی جماعتوں سے مکالمہ و گفتگو کروں۔ چناں چہ ترکوں، مصریوں، ایرانیوں اور چینیوں سے اس سلسلے میں باہم گفتگو و مکالمہ جاری رہا۔ اور پھر مجھے اپنے اس پروگرام کو اردو زبان میں شائع کرنے کی توفیق ہوئی۔ پھر انگریزی

میں بھی یہ پروگرام طبع ہوا۔ اور دنیا بھر میں موجود ہندوستانی اور دیگر لوگوں تک اس کو پھیلانے کی بھی مجھے توفیق ہوئی۔(22)

میں چاہوں گا کہ ہر ایسے آدمی کو — جو مسلمانوں میں سے سیاسی کاموں میں مشغول ہو — یہ پروگرام ضرور پڑھنا چاہیے۔ اسے انقلابی اصولوں کو بغیر کسی فہم و بصیرت کے جلد بازی میں نہیں قبول کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو آدمی انقلاب کے میدان میں قدم رکھنا چاہتا ہے اس کی زندگی کا لازمی تقاضہ اور اہم فریضہ اپنے انقلابی مسلک کے مطابق آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ انقلابی نظریہ اپنانے کے بعد اُلٹے قدم پیچھے کی طرف جانا قطعاً جائز نہیں ہوتا۔

تمام دینی اور لادینی جماعتوں میں انقلابیوں پر آگے بڑھنا لازمی فرائض میں سے ہوتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ اسلام میں مرتد کی سزا سوائے قتل کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ مسلمانوں کی اکثریت انقلاب کا مفہوم نہیں سمجھتی، اس لیے یہ لوگ اگر ایک دن دنیائے عالم پر انقلاب کا جھنڈا لہرانے کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں، تو کچھ دنوں کے بعد ان کا خیال ہوتا ہے کہ انقلاب ان کے دینی اور ملی حقوق پر مبنی خواہشات کے خلاف ہے۔ اور واپس لوٹ جاتے ہیں اور یوں درمیانِ راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں۔

ہندوستان چھوڑنے کے بعد سے جب بھی ہم نے انقلابی جمعیت اکٹھا کرنے کی کوشش کی تو ایسی حالت میں ہم رجعت پسندوں کو راستے سے ہٹانے کا حکم تو نافذ نہیں کر سکتے تھے، لیکن ہم نے اس بات کا حلف لینے کی صورت اختیار کی کہ جس شخص پر انقلابی جمعیت کی جانب سے رجعت پسندی کا الزام ثابت ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو قتل یعنی اس راستے سے ہٹا لے۔ اس سلسلے میں ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! بے شک تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ سو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو اور پھر اپنے آپ کو قتل کرو! تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک یہی بہتر ہے۔ پھر اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہی بڑا توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔) (۲:۵۴) (23)

فصل (5): دینی انقلاب میں دنیا و آخرت کی جامعیت

یہاں پر ہم مسلمانوں میں سے ہر اُس آدمی کو جو انقلاب کے مسائل میں مشغول ہونا چاہتا ہے، ایک اہم فائدے پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی تحریکات دنیا اور آخرت دونوں کی ترقی اور کامیابیوں کو باہم جمع کرنا چاہتی ہیں۔ جب ہم دنیاوی ترقی کو پوری جامعیت کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ

دینی تحریک دراصل انقلابی تحریک ہوتی ہے۔ یعنی وہ مستضعفین اور کم زور لوگوں کو ظلم سے بچانا چاہتی ہیں۔ اور انھیں حکومت کا اہل اور اس کا وارث بنانا چاہتی ہیں۔ (24)

انبیاؑ کی تعلیمات میں ایک انقلابی کے لیے توحید پر ایمان کی شرط

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انبیاؑ میں سے شرائع الٰہیہ کے آئمہ اور ان کی اتباع کرنے والے لوگ یہ شرط لگاتے ہیں کہ ان کی انقلابی جماعت میں جو آدمی داخل ہو، وہ توحیدِ خداوندی کو ماننے والا ہو، مشرک نہ ہو۔ اس میں حکمت کیا ہے؟ جو بات میرے نزدیک تحقیقی طور پر ثابت ہوچکی ہے، وہ یہ ہے کہ جو آدمی فائدوں کے حصول اور نقصان دہ چیزوں سے بچنے کے لیے اپنے رب، خالق و مالک کو چھوڑ کر کسی اور پر اعتماد کرے گا، اسے اپنے آپ پر بھی پورا اعتماد حاصل نہیں ہوسکتا۔

انسانی روح کا بنیادی تقاضہ اور ''محبتِ ذاتیہ'' کی حقیقت

اس سلسلے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے ''باب الایمان'' میں **''العبادۃ حق اللّٰہ تعالیٰ علیٰ عبادہ''** (انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں) کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جاننا چاہیے کہ انسان کی روح میں ایک نورانی لطیفہ ہے، جو طبعی طور پر اللہ کی جانب ایسا میلان اور جھکاؤ رکھتا ہے، جیسا کہ لوہا مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے، جو وجدانی طور پر معلوم ہوتا ہے ..... اللہ کی طرف اس نقطۂ نورانی کے میلان کو ''محبتِ ذاتیہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسا کہ دیگر تمام وجدانی چیزوں کی ہوتی ہے۔ کہ جن کے لیے عقلی دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے بھوکے آدمی کی بھوک اور پیاسے کی پیاس ..... وہ تمام کام جنھیں انسان کے لیے کرنا ضروری ہے۔ وہ درحقیقت اس لطیفہ نورانیہ کا حق ہے۔ جو اللہ کی طرف کھینچتا ہے ..... یہ بات چوں کہ بہت گہرائی کی حامل ہے۔ اور باریک بینی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اس لطیفے کو انسانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا عام طور پر لوگ نہیں جانتے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ''حق'' کی نسبت ان چیزوں کی طرف کی جائے جن کی طرف اس لطیفۂ نورانیہ کا میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے۔ اور جس کو مقصود بنایا جاتا ہے .....
>
> جب ہم نے یہ کہا کہ ''عبادت کرنا اللہ کے بندوں پر اللہ کا حق ہے''، تو یہ دراصل اختصار ہے اس بات کا کہ اس لطیفۂ نورانی کا حق ہے کہ وہ اللہ کی طرف اپنا میلان اور جھکاؤ رکھے۔ اور مناسب ہے کہ اسی پر قرآن کا حق، رسول کا حق، مولیٰ کا حق، والدین کا حق، رشتہ داروں کے حقوق وغیرہ کو قیاس کرلیا

جائے۔ دراصل یہ تمام حقوق اس کے نفس پر اس کے نفس کا حق ہے۔ تاکہ اس کے کمالات کی تکمیل ہو سکے۔ لیکن حق کی نسبت اس طرف کر دی گئی، جس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ پیش آیا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو، اور ظاہر پرستوں کی طرح مت ہو، بلکہ اصل حقائق تک پہنچنے والے محققین کی طرح بنو!''

إنتهٰی بتصرّف (25)

توحیدِ الٰہی سے انسان میں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوتا ہے

میں کہتا ہوں کہ اس قیاس کی بنیاد پر إعتماد علی اللّٰہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے تعلق سے ہمارے اندر اپنے آپ پر اعتماد کرنا آجائے۔ اور جب کسی آدمی کو اپنے آپ پر اعتبار کرنے کے لیے کسی دوسرے آدمی کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہ رہے تو وہ پکا موحد بن جاتا ہے۔ اور وہ ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے۔ جنھیں اپنے اوپر پورا اعتماد ہے۔ اور ان لوگوں سے علاحدہ ہو جاتا ہے، جنھیں اپنے اوپر اعتماد کرنے کے لیے کچھ لوگوں کے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی ایسے آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جو انقلاب کے معنی جانتا ہو۔ اور یہ کہ انقلاب کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک انسان کو اپنے اوپر مضبوط اعتماد نہ ہو۔

شریعت کی زبان میں رجعت پسندی دو طرح ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو انقلابی پروگرام کو چھوڑ دینے سے رجعت پسندی پیدا ہوتی ہے۔ اب ارتداد کی سزا صرف اس لیے ہے کہ وہ انقلاب میں رجعت پسند واقع ہوا ہے۔ اور دوسرے اس صورت میں کہ وہ انقلاب کے نصاب کو پورا نہیں کر سکا۔ واللّٰہ سبحانہٗ أعلم

فصل (6): سلاطینِ دہلی کی تاریخ کا مطالعاتی تجزیہ

ہم یہ چاہتے ہیں کہ سلاطینِ دہلی کی تاریخ کا جو مطالعہ ہم نے کیا ہے۔ اس کا کچھ تھوڑا سا تذکرہ یہاں پر کر دیں۔ جیسا کہ ہم نے سلاطینِ استنبول کے حوالے سے اپنے مطالعے کے کچھ پہلوؤں کے بارے میں چند اشاروں کا ذکر گزشتہ فصل (باب نمبر 7، فصل 1) میں کیا ہے۔ کیوں کہ یہ طرزِ تفکر ہی عالمی انقلاب کے مطالعے کے لیے بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی سے اس نظریے کے نظائر و شواہد ہمارے سامنے واضح ہوتے ہیں۔ جس کا تذکرہ ہم نے پانچویں فصل میں کیا ہے۔

سلطان جلال الدین اکبرؒ کی سلطنت کے چند بنیادی پہلو

۹۸۷ھ (1579ء) میں سلطان جلال الدین محمد اکبر غفر اللّٰہ له وأنار بُرهانهٗ (اللہ ان کو معاف فرمائے، اور ان کے اچھے کاموں کو زندہ رکھے) کے زمانے میں ہندوستانی سلطنت کا طرزِ حکومت ''اسلامیت'' سے ''وطنیت'' میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور یوں ہندوستانی حکومت ''السلطنة الملية الوطنية'' (قومی ملی حکومت) کے پروگرام کے مطابق کام کرنے لگی تھی۔

ہندوستانی سلطنت میں یہ تبدیلی چند مقاصد کے حصول کی ایک تدبیر تھی:

1۔ ایک مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے ایسے غیر مسلم جو سلطان شیر شاہ سوریؒ کی جانب اپنے ہم وطن ہندوستانی اور افغانی ہونے کی وجہ سے مائل تھے، انھیں مغل حکومت کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔

2۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ عدل و انصاف کے قیام میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق اور تمیز پیدا نہ کیا جائے۔

3۔ تیسرا مقصد یہ تھا کہ ایران کی صفوی حکومت کے حق میں اپنے خلوص کا اظہار کیا جائے۔ اس لیے کہ اکبر بادشاہ کے والد سلطان نصیرالدین ہمایوں نے سلطان شیر شاہ سوری کی اولاد سے اپنی مملکت واپس لینے کے لیے جب ایرانیوں سے مدد مانگی تھی تو ان سے ہندوستانی سلطنت میں ایرانیوں کے بعض حقوق تسلیم کرنے کا معاہدہ بھی کیا تھا۔

اس طرح جلال الدین اکبر نے اپنے آپ کو ہندوستانی ممالک پر خلیفہ کے طور پر فائز کر لیا تھا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان نورالدین جہاں گیر کے زمانے میں بھی سلطنت انہی اصولوں پر چلتی رہی۔

اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان شہاب الدین شاہ جہاں نے بعض کاموں میں مناسب اصلاح کے بعد سلطنت کو اسی طرح چلائے رکھا۔

جب سلطان شاہ جہاں ۱۰۶۹ھ (1659ء) میں فالج کی وجہ سے سلطنت کا نظام چلانے سے معذور ہو گیا تو اس کے ولی عہد اور سب سے بڑے بیٹے ''داراشکوہ'' نے زمامِ سلطنت سنبھالی۔ داراشکوہ سیاست وطنیہ کے اصول پر سختی سے کاربند تھا۔ اور بہت زیادہ شدت کے ساتھ سلطنت کے مختلف عناصر کے درمیان مساوات کے اصول کو نافذ رکھے ہوئے تھا۔

اسی دوران شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا محی الدین عالم گیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے سلطنت کے حصول کے لیے داراشکوہ کے ساتھ لڑائی لڑی۔ اور بالآخر اس پر غالب آ گیا۔ اور جب اس کی حکمرانی کا غلبہ قائم ہو گیا تو اس نے ۱۰۶۹ھ (1659ء) میں ہندوستانی سلطنت کی تنظیم نو کرتے ہوئے اُسے ''خلافتِ اسلامیہ'' کے اصول پر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

فصل (7): سلطان جلال الدین اکبرؒ کی سلطنت کا تحلیل و تجزیہ

سلطان جلال الدین اکبر کے زمانے میں ہندوستانی سلطنت کا مرکزی دفتر چار قسم کے وزرا اور اُمرا کا مجموعہ تھا:

1۔ تورانی اُمرا: یہ اُمرا شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ سنی حنفی تھے۔

2۔ ایرانی اُمرا: یہ اُمرا شیعہ امامیہ مسلک رکھتے تھے۔

3۔ ہندوستانی مسلمان اُمرا: (یہ شاہی خاندان کے علاوہ دیگر مسلمان اُمرا تھے اور) انہی میں سے افغانی بھی شمار کیے جاتے تھے۔ اور یہ بھی تورانیوں کی طرح حنفی تھے۔

4۔ ہندوستانی غیر مسلم اُمرا۔

سیاسی درجے کے اعتبار سے یہ چاروں عناصر مساوی حیثیت کے مالک تھے۔ اس حوالے سے کسی مسلمان کو کسی غیر مسلم پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ اور نہ ہی کسی سنی کو کسی امامی شیعہ پر کوئی بالادستی حاصل تھی۔ اسی لیے انھوں نے غیر مسلموں پر سے جزیہ ختم کر دیا تھا۔ اور وزارت، نظامت اور قیادت ایسے حکومتی مناصب کی ذمہ داریوں میں انھیں اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ اس طرح تقریباً 80 سال کا عرصہ گزر گیا۔

سلطان اور اس کے اکثر اُمرا اگرچہ حنفی تھے، لیکن حکومت کے ادارتی نظام کے بنیادی ستون کی حیثیت میں شیعہ اور غیر مسلم بھی برابر کے شریک تھے۔ شیعہ اُمرا مصالح مرسلہ (عمومی مصلحتوں) کو سمجھنے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ اس لیے کہ یہ لوگ (بارہویں) امام کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے شریعت پر عمل کرنے کو اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ان غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد رکھتے تھے، جو اپنے شہروں کی عمومی مصلحتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ نیز ہندوستانی غیر مسلم اُمرا مالی معاملات کے حوالے سے بھی، یعنی ٹیکس وغیرہ کا درست نظام قائم کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

اس زمانے میں عام لوگوں کی اکثریت بالکل عضوِ معطل بنی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ ان میں اجتہاد کی قوت و صلاحیت بالکل نہ تھی۔ اگرچہ ایک جماعت ایسی تھی جو مجتہد فی المذہب کے درجے پر فائز تھی۔ اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ سلطنت میں ''وطنیت'' کی جگہ پر ''اسلامیت'' کا انقلاب پیدا ہو جائے۔ اس مسلک کی ایسی علمی سیاسی جماعت کی تنظیم سازی کے رہنما امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تھے۔

فصل (8): سلطان محی الدین عالم گیرؒ کا تجدیدی کام

بارھویں صدی کے شروع میں سلطان محی الدین محمد عالم گیر قدّس اللّٰہ سرّہٗ العزیز امام اور مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی سلطنت کے طرزِ حکومت کو ''وطنی اجتماعیت'' کے دائرے سے نکال کر ''دینی اسلامی سلطنت'' کی صورت میں قائم کرنے کا تجدیدی کام کیا ہے۔ اور ہندوستان کے مختلف زبانیں بولنے والے اور بہت سے مذاہب رکھنے والے بیس کے قریب ہندوستانی ممالک پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ انھوں نے ہندوستان پر کمالِ متانت اور تدبر کے ساتھ تقریباً پچاس سال حکومت کی۔ اور خلافتِ اسلامیہ کا اعلان کر دیا۔ لیکن جب انھوں نے حجازِ مقدس کی خدمت کے لیے اس کو اپنے دائرۂ حکومت میں لانے کی کوشش کی تو انھیں اس کی توفیق نہ ہو سکی۔

یہاں ہم سلطان عالم گیر کے حالاتِ زندگی ''سلک الدرر'' سے نقل کرتے ہیں:

''سلطان محمد اورنگ زیب عالم گیر ہمارے زمانے میں ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ امیر المؤمنین ہیں اور مسلمانوں کے امام ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کو منظّم کرنے والے ہیں۔ مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ عالم اور علامہ ہیں۔ صوفی اور عارف باللہ ہیں۔ کفر کو مٹانے والے اور دین کو قائم کرنے والے ہیں۔ اسلام کو مضبوط کرنے والے ہیں۔ اور ہندوستان میں اس کی روشنی کو پھیلانے والے ہیں۔ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے والے ہیں۔ وہ زمانے کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہیں۔ ان کے نظامِ سلطنت کی کوئی مثال نہیں۔ انھوں نے ۱۰۶۸ھ (1658ء) میں نظامِ مملکت چلانا شروع کیا۔ اللہ نے ان کے ذریعے سے ہندوستان والوں کے لیے بڑی بھلائی پیدا کی کہ انھوں نے وہاں سے ظلم ختم کر دیا۔ ٹیکس معاف کر دیے۔ ہندوستانی اُفق پر عدل وانصاف کا سورج طلوع ہوگیا۔ اور ہندوستان میں علم وشعور کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اہل علم کو اتنے اونچے درجے پر پہنچا دیا کہ دنیا کے تمام شہروں سے لوگ وہاں پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے زمانے میں اُن جیسا مسلمانوں میں کوئی بادشاہ نہیں ہے۔ حسن سیرت میں، اللہ سے ڈر اور خوف کرنے میں، عبادت میں مشغول ہونے میں ان کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے علاقے کے حنفی علما کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے نام سے ایک فتاویٰ جمع کریں، جس میں اس دور میں انسانی ضرورت کے تمام احکاماتِ شرعیہ حنفی مذہب کے مطابق جمع کر دیے جائیں۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں جمع ہوکر تیار ہوئی اور اس کا نام ''فتاویٰ عالم گیری'' رکھا گیا۔ یہ فتاویٰ تمام مسلمان علاقوں حجاز، مصر، شام، روم میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اور اس کا نفع تمام لوگوں کو ہوا۔ اور تمام مفتیوں کے لیے یہ کتاب مرجع بن گئی۔ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ اسی طرح حکومت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ماہِ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (فروری 1707ء) میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی حکمرانی کے پچاس سال گزارے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی وسیع رحمت نازل فرمائے۔'' إنتهى ملخّص سلک الدّرر (26)

فصل (9): عالم گیری عہد کا تحلیل و تجزیہ

سلطان محی الدین عالم گیرؒ نے غیر مسلموں کو دوبارہ ذمّیّین کے رُتبے پر پہنچا دیا۔ اور ان پر جزیہ لگا دیا۔ ان سے اُمورِ مملکت میں مساوات کی بجائے ضرورت اور حاجت کے مطابق تعاون لیا۔ اسی طرح سلطان نے جنوبی ہندوستان کی حکومتوں کو بھی اپنے زیر نگیں کرلیا، جو شیعہ اُمرا کے قبضے میں تھیں۔ اس کے نتیجے میں ایرانی حکومت خوف زدہ ہوگئی اور ہندوستانی شیعہ بھی ناراض ہوگئے۔

اب سلطان کے بااعتماد لوگ سوائے تورانی اور ہندوستانی حنفیوں کے اور کوئی نہ رہے۔ سلطان کی اصلاح و

تجدید کا کام علما و مشائخ، اُمرا اور عوام سب میں سرایت کر گیا۔ اور انھوں نے آگے بڑھ کر بہت سے اُمور میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ چناں چہ ایسے علمی مدارس منظم کیے گئے جن میں تمام علوم کی تعلیم و تعلّم کا خرچ بیت المال سے کیا جانے لگا۔ اور قضا و اِفتا کے معاملات میں ''فتاویٰ عالم گیری'' پر اعتماد کی وجہ سے علما کے درمیان کوئی فقہی اختلاف باقی نہ رہا۔

دینی حکومت کے ضروری لوازمات اور تقاضے

لیکن دینی حکومت کو قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے اس کے علاوہ بھی چند چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حکومت کے لیے یہ لازمی اور ضروری تھا کہ اہل حل وعقد کے مرکزی اجتماع میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہونی چاہیے جو:

1۔ دین کے اصول اور فروع میں تحقیق و اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں۔
2۔ ان میں فقہی اَخذ و استنباط اور قانون بنانے کا پورا پورا ملکہ ہو۔ اور حکمتِ عملی تشکیل دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔
3۔ اگر بنائے ہوئے قانون کی ظاہری شکل و صورت، قانون کی اصل روح اور مقاصد کو پورا نہ کر رہی ہو تو قانون کی اصل روح کے مطابق نئی قانونی شکل ترتیب دینے کی صلاحیت کے حامل ہوں۔
4۔ ایسے ہی وہ اُن مصالح مرسلہ (عمومی مصلحتوں) کے مطابق عمل کریں۔ جن کا اعتبار اکثر اہل رائے کریں اور وہ ان پر متفق ہو جائیں۔
5۔ اسی طرح یہ بھی ضروی ہے کہ عقل مند لوگوں کا مرکزی اجتماع اور ان کا محل مشاورت، حکومت کے مرکزی دفتر سے قریبی رابطہ رکھے۔

ایسی خصوصیات کی حامل جماعت چند دنوں میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں اگر گزشتہ زمانوں سے پورے تسلسل کے ساتھ انسانیت کو فائدہ پہنچانے والے مشائخ کا سلسلہ قائم رہتا تو ایسی جماعت کا قیام ممکن تھا۔ جب کہ سلطان کے زمانے سے تقریباً سو سال پہلے سے ایسا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ جب کہ مدارس کا یہ حال تھا کہ وہاں سے کوئی ایسا فرد نہیں نکل رہا تھا، جیسا کہ سلطان شیر خان (شاہ) سوری تھا۔ اور نہ (وزیر اعظم) علامہ سعد اللہ جیسے لوگ پیدا ہو رہے تھے۔

عالم گیری سلطنت کے اثرات

حکیم الہند، حضرت الامام، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کی تربیت یافتہ جماعت اگرچہ عالم گیری تجدید کا نتیجہ ہے، لیکن سلطان کو اپنا نظامِ مملکت چلانے کے لیے جیسی تنظیم کی ضرورت تھی، وہ ولی اللّٰہی جماعت کی صورت میں سلطان

کے انتقال کے ساٹھ سال بعد پیدا ہوسکی۔ اور یہ وہ دور تھا، جب سلطنت کے تمام اجزا میں کمزوری کے اثرات سرایت کر چکے تھے۔ اس لیے کہ جب اللہ نے سلطان کو اپنے پاس بلالیا تو ایک طرف ہندوستانی غیر مسلموں میں سے مرہٹہ اور سکھ سرداروں نے بغاوت کردی اور دوسری طرف شیعہ امامیہ کا غضب بھی بھڑک اُٹھا، جب کہ سلطان کے بعد آنے والے کسی بادشاہ میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اُس کی سیاست کے مطابق نظام کو جاری رکھ سکے۔ ایسی صلاحیت نہ اُس کے خاندان میں تھی، نہ اس کے متبعین میں تھی، نہ اُمرا اور علما میں تھی۔

ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو مزید تعجب اس پر ہوتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ سلطان محی الدین عالم گیرؒ کے تخت پر بیٹھنے والا اس کا سب سے بڑا بیٹا سلطان بہادر شاہ تھا، جو کہ امامی شیعہ تھا۔ اور پھر سلطان بہادر شاہ اول کے بعد مرکزی دفتر میں اختلافات سرایت کر گئے۔ اور یوں اس میں کمزوری آ گئی۔ اور پھر باہمی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب شیعہ امامیوں کا تسلط ہوا تو انھوں نے سنیوں کو ذبح کیا، جیسا کہ فرخ سیر کے زمانے میں ہوا۔ اور جب تورانیوں کا غلبہ ہوا تو انھوں نے شیعوں کو قتل کیا، جیسا کہ محمد شاہ کے زمانے میں ہوا۔

جب کہ مرہٹہ باغی ہر دن بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس لیے کہ ان کی مدد وہ تمام اُمرا کر رہے تھے جو مغلوب ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ وہ جنوبی ہندوستان میں ٹیکس وصول کرنے میں سب سے پہلے شریک ہوئے۔ پھر وہ شمالی ہندوستان کے کچھ علاقوں پر غالب آ گئے۔ اور جب سلطنت کی کم زوری ظاہر ہوگئی تو ایران سے نادر شاہ آیا۔ اس نے دارالخلافت کو لوٹ لیا۔ جو لوگ وہاں تھے، انھیں قتل کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد احمد شاہ (ابدالی) افغانی، جس نے قندھار اور کابل پر غلبہ پا لیا تھا، اُس نے ہندوستان میں غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔

فصل (10): شاہ ولی اللہؒ کا نظریۂ انقلاب

حکیم الہند، حضرت الامام، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، محمد شاہ کے زمانے سے لے کر احمد شاہ (ابدالی) افغانی کے آخری عہد تک ہندوستانیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا بخوبی مشاہدہ کر رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں آپ سیاسی انقلاب کی روح اور اس کے تقاضے پر متنبہ ہوئے۔ اور انھوں نے اس نقطۂ نظر سے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' وغیرہ میں فلسفۂ شرعیہ کی تدوین و ترتیب کی۔ اور لوگوں کو اپنے افکار کی اتباع کرنے کی دعوت دی۔ اور اس بات کی تصریح کی کہ وہ اس دور کے امام ہیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ زمین ایک بہت بڑے انقلاب کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ لیکن اُس زمانے کے اہل حل وعقد اس طرف متوجہ نہیں ہو رہے۔ اور انھوں نے عزت و مرتبت کی طرف واپس لوٹنے کے جتنے بھی امکانات تھے، انھیں گنوا دیا۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں جب اپنا نظریۂ انقلاب تحریر کرتے ہوئے فرمایا:

''وما تراہ من ملوک بلاد ک یغنیک عن حکایاتھم (أی قیصر و کسریٰ).''

''وہ جو تم اپنے علاقے کے بادشاہوں کی عیاشیوں کو دیکھتے ہو تو یہ تمہیں قیصر و کسریٰ کے واقعات سے مستغنی کر دیں گی۔''

اس جملے میں اس بات کا اشارہ تھا کہ یہ لوگ بھی انقلاب کے مستحق ہیں، جیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کے خلاف انقلاب برپا کرنا ضروری تھا۔ پھر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''تفہیماتِ الٰہیہ'' میں ہندوستانی سوسائٹی کی ہر ہر جماعت کی خرابیوں کو بیان کیا اور انھیں اس کے انجام سے ڈرایا۔

اس کے بعد قریب زمانے میں ہی یورپ کی اقوام مسلح ہوگئیں۔ اور ہندوستان آ پہنچیں۔ انھوں نے ان اصولوں کو اپنے پیش نظر رکھا، جنھیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انقلاب کے لیے تحریر کیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے ہندوستان پر غلبہ پالیا۔ اور یہ اُن لوگوں کی سزا ہوتی ہے، جو سچائی سے اعراض کرتے ہیں اور حق سے روگردانی کرتے ہیں۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ (۱۰:۵۹)

(اے ہمارے پروردگار! ہمیں معاف فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی معاف فرما، جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے۔)

فصل (11): ولی اللّٰہی جماعت کا کام اور ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد ان کے بیٹے حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اپنے والد کے انقلابی فلسفے پر تنظیم سازی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور انھوں نے عام مسلمانوں میں سے ایک علمی اور انقلابی جماعت منظم کر دی۔ اور انھوں نے ۱۲۳۱ھ بمطابق 1816ء سے کام شروع کر دیا۔ یہی وہ جماعت ہے، جس نے افغانیوں کے پہاڑی علاقے ''پنج تار'' میں ۱۲۴۲ھ بمطابق 1828ء میں ایک حکومت قائم کی تھی۔ اور پھر بعض اُمرا کی خیانت اور ریاستی جھگڑوں میں ان کی سازشوں کی وجہ سے یہ جماعت شہید ہوگئی۔

جب برطانوی حکمرانوں نے (مغل حکومت کے ساتھ کیے گئے) معاہدات کی شرائط اور حدود و قیود سے تجاوز کیا تو ہندوستانی لوگ ۱۲۷۳ھ (1857ء) میں ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کام کی ابتدا کرنے والے امام عبدالعزیز کی تربیت یافتہ جماعت کے لوگ تھے۔ انہی لوگوں نے اس جنگِ آزادی کی دعوت دی تھی۔ اور یہی لوگ کثرت سے اس جنگِ آزادی میں شہید بھی ہوئے۔ لیکن ریاستوں کے نوابوں اور جاگیرداروں نے برطانویوں کی مکمل مدد کی۔ اس کے نتیجے میں اس جنگِ آزادی میں ہزارہا ہندوستانی قتل ہوگئے۔ حتیٰ کہ ہندوستانیوں نے ہی ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اس کے بعد ۱۲۷۴ھ (1858ء) میں (انگریزوں کی) ایک چھوٹی سی جماعت ایک بہت بڑی (ہندوستانی) قوم پر غالب آ گئی۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ (۲:۱۴۷)

(اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں جو ہم سے زیادتی ہوئی ہے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کی قوم پر ہمیں مدد دے۔)

فصل (12): استنبول سے حجاز تک کا سفر

میں نے سلاطین دہلی کے شاہی محلات نہیں دیکھے۔ نہ دہلی میں اور نہ دیگر جگہوں میں۔ اسی طرح میں استنبول میں سلاطین عثمانیہ کے محلات بھی دیکھنے کے لیے ان میں داخل نہیں ہوا۔ مجھے اس پر بہت افسوس ہوا، جو کچھ میں نے بخارا میں دیکھا کہ وہاں مسجدیں اور مدرسے لوگوں سے خالی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔

میں (5 جون 1926ء کو) استنبول سے نکلا اور اِٹلی اور سوئزر لینڈ پہنچا۔ وہاں میں نے ہندوستانی اور یورپین افراد سے ملاقات کی۔ میں نے جدید اِٹلی کی سیاست کا بھی تھوڑا بہت مطالعہ کیا۔ پھر مجھے افریقہ کے ساحل پر اطالوی نوآبادی (ایری ٹیریا کی بندرگاہ) ''مصوع'' نامی شہر کی طرف سفر کرنے کی سہولت میسر آئی۔

اس طرح میں ۵/صفر ۱۳۴۵ھ (15 اگست 1926ء) کو "مصوّع" سے حجاز پہنچا۔ (29) پس اللہ کا بہت شکر ہے کہ اس نے مجھے بلداللّٰہ الأمین (مکّۃُ المکرّمہ) میں پہنچنے کی ایسے وقت توفیق عطا فرمائی، جب کہ اسلام میں میری عمر کے چالیس سال مکمل ہو چکے تھے۔ و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین.

www.rahimia.org

حواشی وحوالہ جات

1۔ اردو خودنوشت میں حضرت سندھیؒ لکھتے ہیں:

''۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا، اپنے مطالعے کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں، دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے دونوں رسالے پسند فرمائے، اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔'' (خطبات ومقالات، ص221، طبع دارالتحقیق والاشاعت، 33/A کوئینز روڈ، لاہور)

2۔ اردو خودنوشت میں ہے کہ: ''اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے وابستہ ہوگئے۔'' (ایضاً، ص222)

3۔ اردو خودنوشت میں لکھتے ہیں: ''اس مدرسے میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی، اور امام مالک کو بھی خواب میں دیکھا۔'' ایضاً ص222۔

4. قال الشافعي: (محمد بن ادريس) إذا ذكر العلماء فمالک النجم، وماأحد أمنّ عليّ من مالک.

بحوالہ مواهب الجليل في مختصر الشيخ خليل، باب ترجمه مالک، الجزء ۱، ص82، "المكتبة الشاملة".

5۔ دارالعلوم ''القاسم'' اور ''الرشید'' کے نام سے رسائل نکلتے تھے، اس سلسلے کی تمام تفصیلات ان دونوں رسالوں میں برابر چھپتی رہی ہیں۔ ملاحظہ ہو ''القاسم'' و ''الرشید'' 1909ء تا 1913ء۔

6۔ یہاں پر یہ وضاحت کرنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض محققین نے مولانا سندھیؒ کی اس روایت پر غیر ضروری طور پر اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔ چناں چہ ہمارے محترم دوست مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنی کتاب ''استاذ العلماء مولانا مملوک العلی نانوتویؒ'' میں لکھا ہے کہ ''اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سرسید نے مولانا مملوک العلیؒ سے یا دہلی کالج میں پڑھا ہو''، ''مولانا سندھیؒ سے پہلے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا''۔ (ص532) ''صرف مولانا سندھیؒ کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔'' (ص545) اور پھر خود ہی خیال آرائی فرمائی ہے کہ: ''میرا خیال ہے کہ مولانا سندھیؒ نے سرسید احمد کے دلی کالج کے طالب علم ہونے کی روایت غالباً فرحت اللہ بیگ سے حاصل کی ہے۔'' (ص544)

یہ سب باتیں درست نہیں ہیں، اس لیے کہ مولانا سندھیؒ وہ فرد ہیں، جنھوں نے حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی صحبت اُٹھائی اور سلسلۂ ولی اللّٰہی کے ان علما کے بارے میں جو خاص طور پر دہلی اور اس کے اطراف سے تعلق رکھتے ہیں، شیخ الہندؒ سے رہنمائی لی ہے۔ نیز حضرت سندھیؒ کے ایک اہم استاذ حضرت مولانا محمد احمد نانوتویؒ ثم دیوبندی ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے صاحبزادے اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا محمد احمدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فیض یافتہ اور ان کی روایات کے امین ہیں۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ وہ رہنما ہیں، جنھیں مولانا مملوک العلیؒ سے نہ صرف تلمذ حاصل ہے۔ بلکہ آخری وقت تک ان کی خدمت میں مصروف ومشغول رہے۔ پھر مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، جو کہ حضرت مولانا مملوک العلیؒ کے صاحب زادے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس بھی رہے۔ ان حضرات کی روایات وحکایات سے دارالعلوم دیوبند کے در وبام خوب واقف رہے ہیں۔ مولانا سندھیؒ کی تمام تر تربیت دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں ہوئی۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت

مولانا محمد احمد صاحب سے آپ نے اس سلسلے کے بہت سے واقعات و حکایات سنی ہیں۔ خاص طور پر مولانا مملوک العلی نانوتویؒ سے متعلق روایات، انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے ان ہی حضرات سے سنی ہیں۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:

''سمعت من مناقب شیخ الإسلام (النانوتویؒ) وقائعه کثیراً عن جماعة، متهم الشیخ أبو الطیب أحمد بن شیخ الإسلام الدیوبندی مدیر دارالعلوم فإنه کان یحکی لنا کل یوم شیئًا من الواقعات. کان أستاذ الأساتذة مولانا مملوک العلی یتفرس فی حقه انه سیصیر مثل مولانا محمدإسماعیل الشهید.'' ص11، التمهید.

پھر علی گڑھ اور دیوبند سے متعلق واقعات و معاملات کے سلسلے میں حضرت سندھیؒ کو تمام رہنمائی حضرت شیخ الہندؒ سے حاصل ہوئی ہے۔ چناں چہ حضرت سندھیؒ لکھتے ہیں:

''وفوق ذالک إنما تعلّمتُ فی تلک الملازمة کیف یمکن الإتحاد مع جماعات المسلمین المخالفین لطریقتها فی بعض شئونهم.'' التمهید ص24.

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی یہ اطلاع کہ ''سرسید احمد خان اور حضرت نانوتویؒ مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کے شاگرد ہیں'' اپنے اساتذہ کرام خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند سے روایت کردہ ہے۔ اس لیے یہ قابل اعتماد ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کے درمیان باہمی تعلقات کے جو سیاسی، سماجی اور نظریاتی پہلو ہیں، اُن پر مولانا سندھیؒ کی خاص نظر ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس اطلاع کا ثبوت کتابی نقطۂ نظر سے نہیں ملتا۔ اور اس کا اعتراف خود سرسید نے نہیں کیا۔ اس سے یہ لازم آیا کہ اس روایت یا اطلاع کا انکار کر دیا جائے۔ یہ درست نہیں اس لیے کہ جو حوالہ جات خود محقق و موصوف نے بیان کیے ہیں۔ انھیں میں ایسے اشارات اور قرائن موجود ہیں، جو اس اطلاع کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور جنھیں محقق موصوف نے نظر انداز کر دیا ہے۔ خود سرسید نے ''آثارُ الصّنادید'' میں مولانا مملوک العلی کے تذکرے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے إقتضاء النّص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے ان سے فیض حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سیاسی وجوہات کی بنا پر وہ کھل کر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ چناں چہ سرسید کے الفاظ یہ ہیں: ''کتبِ درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو ان کتابوں سے گنجینۂ علم خالی ہو جائے تو ان کی لوحِ حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے۔'' (ص538) سوال یہ ہے کہ سرسید نے اگر ان کی مجالس درس میں شرکت نہیں کی تو ''کتبِ درسیہ'' کے استحضار کی حالت کا اندازہ کیسے ہوا؟ یہ عبارت تقاضہ کرتی ہے کہ مولانا مملوک العلی کی صحبت سے انھوں نے فیض اُٹھایا ہے۔ جب کہ سرسید کے مکتوبات سے جو عبارت محقق موصوف نے نقل کی ہے، اس سے پہلے لکھتے ہیں کہ: ''ان مندرجات میں بھی مولانا سے ذاتی روابط کا ذکر بلکہ اثر و نشان بھی نہیں جھلکتا۔'' (ص540) حال آں کہ مکتوبات سے نقل کردہ عبارت میں مولانا مملوک العلی نانوتویؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں: ''ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت ہے۔'' (ص540) سرسید کی یہ عبارت نہ صرف ذاتی روابط کا اظہار کر رہی ہے، بلکہ ذاتی واقفیت اور تعلق کو بھی واضح کر رہی ہے۔

پھر اس کتاب میں مصنف کی تحقیق کے ایک اور پہلو پر بھی غور کیا جانا ضروری ہے۔ ایک طرف سرسید مولانا مملوک العلیؒ کے

''کتب درسیہ کے استحضار'' کی خبر دے رہے ہیں اور پھر ان سے اپنی ''ذاتی واقفیت'' کی نشان دہی بھی کر رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود وہ مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کے فیض یافتہ یا ان سے استفادہ کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن خود محقق نتائج اَخذ کرنے پر آتے ہیں تو بغیر کسی واضح ثبوت کے مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کو حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کا شاگرد ثابت کرنے کے لیے دور دراز کے قیاسات بیان کرتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں: ''اس لیے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی (الٰہی بخش) صاحب سے عربی ادب کی اعلیٰ درجے کی کتابیں ..... پڑھ رہے ہوں گے۔'' (ص93) حال آں کہ جس قلمی بیاض سے یہ نتائج اَخذ کیے جا رہے ہیں، اس بیاض پر تحریرات درج کرنے کی تاریخ نہیں ہے۔ جب کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بیاض پر یہ تحریر مولانا مملوک العلی کے زمانۂ تدریس کی ہو۔ اور اس کا قرینہ اس تحریر کے آخر میں ''مملوک الطلباء مملوک العلیؒ'' (ص91) کے دستخط ہیں۔

اب ایک طرف تو محقق موصوف مولانا مملوک العلیؒ کو مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کا شاگرد ثابت کرنے کے لیے تو اپنے اندازوں اور قیاسات پر اعتماد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس کے بعد حضرت مفتی الٰہی بخش کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہوگا۔'' (ص105) اور اس کی بنیاد پر مولانا مناظر احسن گیلانی اور مفتی محمود احمد نانوتویؒ کی تحریرات کا انکار کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف مولانا سندھیؒ کی روایت کردہ اطلاع اور روایت پر جو یقیناً انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے اساتذہ سے سنی ہے، اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ سرسید مولانا مملوک العلیؒ سے استفادے اور تلمذ کا کھل کر اظہار نہیں کرتے تو اس کی وجہ محقق کے بیان کردہ اس جملے سے خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ: ''مولانا مملوک العلیؒ کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ مدرسہ دیوبند کے صدر مدرس ممتاز عالم اور سرسید کے ہم عصر تھے۔ مولانا یعقوب کو سرسید احمد کے مذہبی نظریات سے کھلا اختلاف تھا۔ مولانا نے ان کی تردید و تنقید بھی کی۔'' (ص540) یہی سبب ہے کہ سرسید جو کہ مولانا یعقوب نانوتوی کے ہم عصر تھے، اپنے تلمذ و استفادے کا کھل کر اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ سیاسیات کے میدان میں اس طرح کے اعترافات حکومتِ وقت کی نظر میں اہم سیاسی نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر 1857ء کے بعد کے دور میں اس طرح کے اظہارات اور اعترافات کے نتائج سیاسی طور پر نہایت خطرناک تھے۔

پھر سیاست کے میدان میں کردار ادا کرنے والی شخصیات کے اعمال و افعال اور اقوال و تحریرات کا درست تجزیہ وہی کرسکتا ہے، جس نے سیاست کے میدان میں شہ سواری کی ہو۔ اور مولانا سندھیؒ کے بارے میں یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ سیاست کے میدان کے شہ سوار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ قائدین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس روایت کو مولانا سید محمد میاں صاحب (ناظمِ عمومی جمعیۃ علمائے ہند) اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے صاحبان نے نہ صرف قبول کیا ہے، بلکہ دیوبند و علی گڑھ کے تعلقات کے حوالے سے انھیں اپنے تجزیے کی بنیاد بنایا ہے۔ کتابی علم و تدقیق اس کے لیے کافی نہیں۔

7۔ چناں چہ مولانا سندھیؒ نے کابل میں لاہور سے ہجرت کر کے جانے والے نوجوان طلبا کو قرآنیات پر جو دروس دیے تھے، انھیں ''الدّین و السّیاسة فی القرآن'' کے عنوان سے ظفر حسن ایبک نے چار جلدوں میں لکھا تھا۔ غالباً یہ عنوان مولانا سندھیؒ ہی کا

www.rahimia.org

دیا ہوا ہے۔ یہ چاروں جلدیں راقم سطور کے پاس محفوظ ہیں۔

8۔ ''علی گڑھ یونیورسٹی گزٹ'' کی اشاعت 25 فروری 1914ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھیؒ کی اپیل پر ''مولوی محمد علی شاہ اور مولوی انیس احمد رفقائے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کو اشاعت اسلام کے لیے انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ دیکھیے! ''علی گڑھ یونیورسٹی گزٹ''، ص5-6 ک1-201، بحوالہ ''برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علما کا کردار'' از ایچ بی خان، طبع قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد۔''

9۔ حضرت سندھیؒ اپنے سفرنامہ کابل میں لکھتے ہیں: ''اپریل 1915ء کے شروع میں دہلی سے سندھ آیا۔ اور چار مہینے مختلف مقامات پر گزارے۔ دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ بفضلہٖ تعالیٰ بلوچستان سے گزر کر 15 اگست (1915ء) کی نمازِ مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی۔ اور توکل علی اللہ بغیر کسی پاسپورٹ حاصل کرنے کے، افغانستان میں داخل ہوا'' .....''اس طرح ہم 15 اکتوبر 1915ء کو کابل پہنچے۔ اتفاقاتِ زمانہ میں یہ بھی ایک عجیب بات سمجھی جائے گی کہ اس تاریخ 15 اکتوبر 1922ء کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا۔ اگرچہ ہماری روانگی 22 اکتوبر کو عمل میں آئی۔'' (کابل میں سات سال، ذاتی ڈائری از حضرت سندھیؒ، ص50,59، مکتبہ کمی دارالکتب، لاہور)

10۔ حضرت سندھیؒ اپنے سفرنامہ کابل میں لکھتے ہیں: ''لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی، جسے ''جنود اللہ'' کہا جاتا تھا۔ اس میں اگر عسکریت تھی تو اس قدر، جتنی ''سالویشن آرمی'' میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دور کر سکے۔'' (کابل میں سات سال، ذاتی ڈائری از حضرت سندھیؒ، ص76، مکتبہ کمی دارالکتب، لاہور)

11۔ اردو خود نوشت میں مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں: ''1922ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی، جس کا الحاق ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے ''گیا'' سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے۔ اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔'' خطبات و مقالات، ص224۔

مولانا سندھیؒ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''1920ء میں ہندوستانی مسلمان ہجرت کر کے ہزاروں کی تعداد میں افغانستان آئے۔ افغانستانی ترکستان میں ان کے لیے نوآبادی قائم کرنے کا قانون بنایا گیا۔ جس میں انھیں مکمل لوکل سیلف گورنمنٹ کے حقوق دیے گئے۔ اسی ضمن میں ہم نے ہندوستانی یونیورسٹی کابل کے لیے اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ یونیورسٹی کا اساسی قانون پہلی بار افغانستان کی ''شاہی کونسل برائے وضع قوانین'' نے چند ترمیمات کے لیے واپس کر دیا۔ لیکن 1922ء میں ترمیم شدہ صورت میں منظور کر لیا۔ اور چند ایک کام بھی شروع ہو گئے۔ ہندوستانی یونیورسٹی کابل کے لیے شاہی فرمان حاصل کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ نیشنل کانگریس کی برانچ کابل میں قائم کی جائے۔ اس لیے ہمیں ''کانگریس کمیٹی کابل'' بنانے کی ضرورت پیش آئی۔'' (خطابات و مقالات، ص137، ''آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ)

12۔ مولانا سندھیؒ ''کابل میں سات سال'' میں لکھتے ہیں: ''اب ہم نومبر 1922ء میں دریائے جیحون عبور کر کے ترمذ میں سوویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے۔ اور دنیا کی انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا۔'' (ذاتی ڈائری، ص101)

13۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کی اس عبارت سے مولانا سندھیؒ کا استدلال یہ ہے کہ جب کسی سوسائٹی کی آبادی دس ہزار سے

اوپر ہوجائے تو اس پر سیاسی حکومت کا کنٹرول قائم کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ تاکہ وسائل رزق کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور استعمالات کے نظام انسانی فائدے کے لیے بنائے جاسکیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ کے یہ الفاظ:

''فالسیاسة المدنیة تبحث عن مکاسبهم'' (شہری سیاست، ان کے پیشوں اور وسائل معاش سے بحث کرے) اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شہر کی سیاسی حکومت پر لازمی ہے کہ وہ لوگوں کے پیشوں اور ذرائع معاش میں مداخلت کرے۔ اور غور و فکر کے بعد سوسائٹی کے مجموعی مفادات کے مطابق ان پیشوں کی تقسیم کرے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ کے یہ جملے بھی قابل غور ہیں:

''فإن وزعت المکاسب و أصحابها علی الوجه المعروف الذی تعطیه الحکمة و قبض علی أیدی المکتسبین بالأکساب القبیحة صلح حالهم.'' اس سے لوگوں کے معاشی معاملات میں حکومتی دخل اندازی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

14. حجة الله البالغه، ابواب ابتغاء الرزق، ص282,281، ج2، طبع بیروت.
15. حجة الله البالغه، باب إقامة الإرتفاقات و إصلاح الرسوم، ص305 تا 308، طبع بیروت.
16. المسوّی من أحادیث المؤطا، الإمام ولی الله دهلویؒ، ص 255،256، مطبوعه جمعیة السلفیة بمکة المکرمة، ۱۳۵۱ھ.
17. إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، ص476، جلد3، مطبوعه قدیمی کتب خانه، آرام باغ، کراچی.
18. ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ، ص474تا 480، جلد3، مطبوعه قدیمی کتب خانه، کراچی.
19. ازالة الخفاء عن الخلفاء، جلد3، ص481تا 483، مطبوعه قدیمی کتب خانه، آرام باغ، کراچی.
20. حواله بالا، ص487.
21۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا یہ مفصل فتویٰ ''فتاویٰ عزیزیہ'' میں موجود ہے۔ اس کی اصل عبارت درج ذیل ہے:

''حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ در رسالۂ خود (احکام اراضی ہند) اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سوادِ عراق کہ در عہدِ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ مفتوح شدہ بود، موقوف بر ملکِ بیت المال است، و زمین داراں را بیش از تولیت و داروغگی تردد، و فراہم آوردن مزارعین، و اعانت و زراعت و حفظ دخلے نیست۔''

(فتاویٰ عزیزیہ، جلد1، ص43، طبع مجتبائی، دہلی، انڈیا)

ترجمہ: ''حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری نے اپنے رسالے میں یہ مؤقف اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اپنی فتح کے زمانہ ابتدا سے ہی عراق کی زمینوں کی طرح (جو کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے۔ اور زمین داروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور و فکر میں رہنے کے سوا اور کوئی حق نہیں ہے۔ اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔''

چناں چہ اس کی بنیاد پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے لکھا ہے کہ: ''علمائے اسلام کے فتاویٰ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کی زمین حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے ....علمائے اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل

www.rahimia.org

بادشاہوں نے اراضیٔ ہند پر جو تصرفات قائم رکھے، نیز بادشاہ شاہ عالم نے سرطامس رو کو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمین داروں کے متعلق جو معاہدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالے کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معاہدہ کیا، وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت، اراضیٔ ہند کو زمین دار اور تعلقہ دار کی ذاتی اور شخصی ملکیت نہیں سمجھتے۔ اور حکومت کی ملک شمار کرتے ہوئے ان کو نگران اور قیم کی حیثیت دیتے تھے۔''

(دیکھیے! اسلام کا اقتصادی نظام، از حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، ص 411 تا 416، طبع مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور)

22۔ مولانا سندھیؒ کا ترتیب دیا ہوا یہ انقلابی پروگرام ''آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ'' کے عنوان سے 15 ستمبر 1924ء کو ترکی سے طبع ہوا تھا، لیکن 1925ء میں حکومتِ برطانیہ نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی۔ پھر 1926ء میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ اور ابواب قائم کر کے بظاہر جزوی تبدیلیاں کر کے دوبارہ شائع کیا گیا، تا کہ پابندی کی زد میں نہ آئے۔ فروری 1956ء میں یہ پروگرام ''انجمن ترقی اردو (پاکستان)'' کراچی کے سہ ماہی مجلّے ''تاریخ و سیاست'' کے شمارے میں طبع ہوا۔ بعد میں پروفیسر محمد سرور (مرحوم) نے حضرت سندھیؒ کے ''خطبات و مقالات'' ترتیب دیے تو اس میں شامل ہو کر طبع ہوا۔ ستمبر 2002ء میں راقم سطور نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے خطبات و مقالات کو نئی ترتیب اور مزید مقالوں کے اضافے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اور اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں دیکھیے! صفحات 131 تا 191۔

23۔ حضرت سندھیؒ نے اس آیت سے جو استدلال کیا ہے کہ ''رجعت پسند لوگ اپنے آپ کو قتل کر لیں'' تو اس سے مراد سیاسی طور پر اپنے آپ کو راستے سے ہٹانا ہے۔ اس سے حقیقی طور پر اپنے آپ کو قتل کرنا مراد نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی طور پر اپنی طاقت ضائع کر دینا، قوم کی ایسی خودکشی ہے، جو جدوجہدِ آزادی کے راستے میں حقیقی جان کے قتل سے کہیں زیادہ نقصان دِہ ہے۔

24۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ یہ بات لکھتے ہوئے قرآن حکیم میں سورۃ القصص کی اس آیت مبارکہ سے استدلال کر رہے ہیں: وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ (۵:۲۸) (اور ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں، جو ملک میں کم زور کر دیے گئے تھے۔ اور انھیں سردار بنا دیں۔ اور انھیں وارث بنا دیں۔)

25. حجة اللّٰه البالغه، ج1، ص204 تا 206، طبع بيروت.

26. سلک الدرر، فی أعیان القرن الثانی عشر، الجزء الرابع، تالیف السید محمد الخلیل المرادی.

27. حجة الله البالغه، باب إقامة الإرتفاقات و إصلاح الرسوم، ص306، طبع بيروت.

28. دیکھئے! التفهیمات الإلٰهیة، تفهیم نمبر 69، جلد اول، طبع حیدر آباد، سندھ.

29۔ اردو خودنوشت میں مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں کہ: ''۱۳۴۴ھ (1926ء) میں موسمِ حج پر مکہ معظّمہ میں ''مؤتمر خلافت'' منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظّمہ پہنچنے کی کوشش کی، مگر میں مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ (اگست 1926ء) میں پہنچا۔'' (خطبات و مقالات، ص 226،)

www.rahimia.org

تحریکاتِ آزادی

ایشیا کی عہد ساز قیادت (1)

شیخ الہندؒ اور تحریکِ آزادی

از: مولانا محمد ناصر

1857ء کے جہادِ حریت میں اگرچہ سفید فام انگریز اس اعتبار سے فتح مند ہوا تھا کہ اس کی ظالم فوجوں نے بے شمار بچوں کو یتیم کر دیا تھا۔ ہزار ہا عورتوں کو بیوہ بنا دیا تھا۔ لاتعداد خاندانوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اور لاکھوں افراد کو اپنی خونی سنگینوں کے تلے روند ڈالا تھا۔ (1)

1857ء کے واقعے پر انگریزوں نے اس قدر اور ایسے ملعون اور شرم ناک مظالم چاروں طرف ہندوستان میں کیے تھے، جن کی نظیر وحشی قوموں اور جاہل سے جاہل ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ توپوں کے منہ پر باندھ کر گولے سے اُڑا دینا۔ ہاتھی کے پیر سے باندھ کر کچلوا دینا۔ زندہ آدمی کو لوہے کی سلاخوں سے داغ کر آگ میں جلانا وغیرہ، معمولی باتیں تھیں۔ اس لیے عام ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ خوف وہراس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (2)

مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

> ''پھر اس زمانے میں سیاست کی طرف آنکھ اٹھانا 1857ء کا سماں باندھتی تھی۔ آزادی کا خواب بھی اگر کسی کو دکھائی دیتا تھا تو اس کا پتّا پانی ہو جاتا تھا۔ خودمختار حکومت کی خواہش، زبان پر لانا سارے جہان کو جلا دینے والی آگ سے زیادہ تباہ کن شمار ہوتی تھی۔ برطانوی خوف نے عالَم (دنیا) کے دل و دماغ پر اپنا رُعب جما رکھا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ دلوں پر جس قدر موجودہ حکومت کا خوف تھا، اس قدر بلکہ اس کا ایک فیصد بھی اللہ پاک قہار وجبار کا اثر نہ تھا۔ جیسا کہ اب بھی بہت سی ہستیاں اسی خیال میں ہیں تو غالباً میں جھوٹ بولنے والا شمار نہ کیا جاؤں گا۔ ایسے نازُک وقت میں ایک شخص کا بھی ہم خیال بنالینا بڑی کامیابی ہے۔'' (3)

آزادی کا نام زبان سے نکالنا بھی خودکشی کے مترادف خیال کیا جانے لگا تھا، لیکن ان چنگیزی مظالم کے باوجود انگریز اس جماعتِ حقانی کے قلوب سے شعلہ ہائے حریت نہ نکال سکا تھا، جس نے برصغیر کے کثیر الآباد خطہ ''یوپی'' کے معروف قصبہ تھانہ بھون کے قریب شاملی کے میدان میں 1857ء کی جنگ آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔

www.rahnia.org

یہ جماعت ان بوریہ نشین درویشوں پر مشتمل تھی، جو محض رضائے خداوندی اور حفاظتِ شریعت (جس میں انسانی حقوق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے) کی خاطر اپنے وطن سے ظالم انگریز کو نکالنے کا پکا عزم کر چکے تھے۔ جن کے رَگ و پے میں آزادی کا خون دوڑتا تھا۔ جو استقامت کے پتلے تھے۔ توکل علی اللہ جن کا سرمایہ تھا۔ مصیبتوں کو برداشت کرنا جن کی فطرت تھی۔ جن کا سر، بارگاہِ ایزدی کے سوا کہیں جھک نہ سکا تھا۔ جس جماعت کی قیادت اگر ایک طرف حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جیسے عارف باللہ کر رہے تھے تو دوسری طرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے مجاہدِ ربانی اور آئمہ یزدانی اس کے سپہ سالار تھے۔ اوران کے ساتھ حافظ محمد ضامن شہیدؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، نواب بہادر خانؒ، مولانا تفضّل حسینؒ اوران جیسے مخلصین واتقیا کی ایک بہت بڑی جماعت اس مقدس فریضے کی تکمیل کر رہی تھی۔ اس جماعتِ حقہ کے مخلص ارکان، رات میں بارگاہِ ربُّ العزت میں سجدہ ریز ہوکر مالکِ ملک سے دعائیں کرتے۔ اوران میں اپنی ہمت و جرأت اور پختہ عزم کا اظہار کرکے رب ذوالجلال سے مدد کے طلب گار ہوتے۔ (4)

1857ء اوراس کے بعد انگریزوں نے ظلم و بربریت کا جو بازار ہندوستان میں گرم کیا، تاریخِ انسانیت اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ 1857ء سے 1867ء تک کے عرصے میں تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ کے لگ بھگ ہندوستانیوں کو انگریز نے قتل کیا۔ اس زمانے میں دہلی کے چاندنی چوک سے گزرنے والی نہر کا پانی عرصۂ دراز تک خون آلود رہا۔ اس درندگی کے اثرات ونتائج سے بچنے کے لیے انگریز نے ان مظالم کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

> ''انگریزوں نے اپنی وحشیانہ درندگیوں کو چھپانے اور اہل ہند (ہندو اور مسلمانوں) کو شیطان اور وحشی وغیرہ ثابت کرنے کے لیے سو سے زیادہ تصانیف تحریر کیں۔'' (5)

مگر اہل حق علمائے کرام اس تمام صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی اس درندگی کی تلخی محسوس کر رہے تھے۔ جھوٹ، فریب، لالچ اور دہشت گردی کے ذریعے راہِ حق سے انھیں ہٹانا ممکن نہ تھا۔ ان آزادی پسند علمائے ربانی نے ملی، قومی اورانسانی ذمہ داری سمجھ کر اس مصیبت سے چھٹکارے کی راہیں تلاش کرنا شروع کیں۔

دارالعلوم کا قیام:

چنانچہ ابھی 1857ء کے معرکۂ آزادی کو مشکل سے دس سال ہی کا عرصہ گزرا تھا۔ اور انگریز کے خوف ناک مظالم ابھی لوگوں کے دلوں سے مٹے نہ تھے کہ مذکورہ مبارک جماعت کے افراد 1857ء کی شکست کا بدلہ لینے، ہندوستانی قوم پر ہونے والے ظلم کو روکنے اور مکمل آزادی کے حصول کے لیے میدان عمل میں نکل آئے۔ اور ''یوپی''

کے ضلع ''سہارن پور'' کے چھوٹے سے قصبہ ''دیوبند'' کی مردم خیز سرزمین پر ایک عظیم الشان انسان نے اپنے شیخ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کی ایما پر اپنے رفیق فکر و عمل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تعاون سے اسلامی درس گاہ اور علمی و عملی تربیت گاہ کی بنیاد رکھ دی، جس نے آگے چل کر دین اسلام کی حقیقی تعلیمات کا تعارف، غلبہ دین، برِعظیم ہند کی آزادی، قومی خودمختاری اور وطن کے باسیوں کے لیے بلاتفریق مذہب عظیم تر خدمات انجام دیں جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم انسان کو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام سے دنیا جانتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی علمی، عملی اور روحانی اثرانگیزی اور اہمیت کا اندازہ امام ربانی سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے ایک ارشاد سے ہوتی ہے، کہ جب بانیانِ دارالعلوم دیوبند میں سے ایک بزرگ حضرت حاجی رفیع الدینؒ حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظّمہ حاضر ہوئے تو وہاں حضرت حاجی امداداللہؒ سے عرض کیا کہ ''حضرت! ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائیں'' حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، لیکن آپ کو یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا فرما۔ یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس گراں قدر دولت کو یہ سرزمین لے اُڑی۔'' (6)

یہ 1868ء کا زمانہ تھا۔ اسلام اور مسلمانانِ ہند کے خلاف عیسائی مشنریوں کا ایک طوفان تھا، جو اُمنڈتا چلا آرہا تھا، جس کا بنیادی مقصد مقامی آبادی اور بالخصوص مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کرکے انھیں فکری شکست قبول کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ اور قومی آزادی کی کوششوں کو فرقہ وارانہ راہ پر ڈال کر تحریکِ آزادی کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنا تھا۔ انگریز چاق و چوبند اور ہر انقلابی کوشش کو کچلنے کے لیے ہر طرح کے حربے اختیار کررہا تھا۔ انگریزی جاسوسوں کا جال پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا، مگر یہ باتیں ان علمائے حق (جو درحقیقت اپنے دور میں وارثانِ انبیا تھے) پر اثرانداز نہ ہوسکیں۔ اور انھوں نے نئے ولولے سے ایک نئے عزم کے ساتھ ایک اچھوتے طریقے سے آزادی اور اسلام کی حفاظت کے لیے دارالعلوم کی تحریک کا آغاز کیا، جس کا مقصد فروغ علم دین قرار دیا گیا۔ اور درپردہ آزادیٔ ہند (7) کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی برابر جاری رہی، جس کا اندازہ آنے والے واقعات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ (8)

دارالعلوم کے قیام کا اصل منشا:

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ دارالعلوم دیوبند کسی ایسے مدرسے یا خانقاہ کا نام نہیں تھا جہاں دنیا اور اس کے مسائل سے قطع تعلقی اختیار کرکے چند کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہو یا چند رسمی اعمال کی تربیت ہوتی ہو۔ یہ تو تحریکِ آزادی 1857ء کا تسلسل ہے۔ فرق صرف ظاہری تھا۔ یہ تحریکِ آزادی پر علم کی چادر تھی۔ دارالعلوم دینی

تعلیم و تربیت کے ذریعے جدوجہدِ آزادی کا مرکز تھا۔ یہ وہ جگہ ہے، جس کی تاسیس سے پہلے اہل باطن اس طرف متوجہ رہے۔ اور اپنی تاسیس کے بعد آزادی پسند لوگوں کا مضبوط قلعہ بنا۔ مسجد چھتہ سے دارالعلوم کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد جس جگہ دارالعلوم کی بنیا درکھی گئی، وہاں آج بھی نودرہ موجود ہے۔ اس جگہ سے جب حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا گزر ہوا تو فرمایا: ''اس جگہ سے علم کی خوش بو آتی ہے۔'' اسی قسم کی ایک روایت حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق بھی ہے۔ سید احمد شہیدؒ انگریز کے خلاف جنگی تیاری اور انتظامات میں مصروف تھے۔ تو اس زمانے میں کافی عرصہ دیوبند قیام کیا۔ اور سید احمد شہیدؒ کے بیشتر رفقا دیوبند ہی کے باشندے تھے۔ اوران میں سے کئی بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ (9)

دارالعلوم دیوبند کے آغازِ قیام ہی سے ان لوگوں نے اس کی تعمیر وترقی، مقاصد کے تعین اوران کے حصول میں کردار ادا کیا ہے، جن کی اصل پہچان دینی تعلیم وتربیت کے ذریعے ہمہ جہت معاشرتی تبدیلی برپا کرنے اور انگریز کے غاصبانہ نظام کے خلاف قوت مہیا کرنا تھی۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند (وقف) کے شیخ الحدیث مولانا سید محمد انظر شاہ مسعودیؒ جو کہ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے صاحبزادے ہیں لکھتے ہیں:

> ''جب دلی پر فرنگی تسلط کی بنا پر اس مرکزی شہر (دلی) میں بیٹھ کر لگائی ہوئی آگ کی چنگاریاں اطراف و جوانب میں پھیلانا ممکن نہ رہیں تو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اورامام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، یہ دونوں داعیانِ حق اس امانت کو لے کر ضلع ''سہارنپور'' کے مشہور قصبہ ''دیوبند'' میں پہنچ گئے۔ گویا کہ حریت پسندی، آزادیٔ وطن، غیر ملکی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ، بے اختیار ''دلی'' کی سرزمین سے ''دیوبند'' کی جانب منتقل ہوگیا۔ اور اپنی خصوصی کوششوں کو جن کا تمام تر تعلق ملکی آزادی کا حصول تھا۔ علم ودانش کے حسین نقاب (پردے) کے تحت جس انداز پر شروع کیا گیا، اس کی پوری داستان ''دارالعلوم دیوبند'' سے وابستہ ہے۔ (10)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند درحقیقت ''ولی اللّٰہی جماعت'' کی وہ امانت تھی، جسے ''دلی'' کے مکتبۂ فکر سے قریبی روابط رکھنے والوں نے بعض اہم مصالح کے پیش نظر ''دیوبند'' منتقل کردیا تھا۔ اور جس پر علم و دانش کا پردہ بظاہر ڈال دیا گیا، لیکن وہ اندرونی طور پر ایک ایسی فوجی چھاؤنی تھی، جس کی مشین پوری تیزی کے ساتھ برطانوی اقتدار کے خلاف مسلسل پُرزے ڈھال رہی تھی۔ یہی نہیں بلکہ دیوبند کے قرب وجوار اور اس کے مضافات میں جو خانقاہیں (11) تعمیر باطن اور کردار سازی کا کام کررہی تھیں، ان کے بارے میں بااعتماد ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آزادیٔ وطن تک ان میں خفیہ ''بیعت جہاد'' بھی لی جاتی تھی۔ اس سلسلۃ الذہب (12) کی آخری کڑی حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعتِ جہاد کرنے والوں میں مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ (شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ ونانا

محترم حضرت شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ) سے اس حقیقت کی تصدیق خود راقم الحروف (مولانا انظر شاہؒ) نے کی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ''خانقاہ تھانہ بھون'' کے علاوہ ہر خانقاہ میں ان جذبات کی خاص پرورش اور نگہ داشت کی جاتی، جن کا مقصد ''برٹش اقتدار'' کے خلاف ان جذبات پر مبنی تھا کہ ''تخت یا تختہ''۔(13)

دارالعلوم دیوبند کی 100 صد سالہ تقریبات منعقدہ 21، 22، 23 مارچ 1980ء کی افتتاحی نشست میں خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب قاسمیؒ نے دارالعلوم دیوبند کے مقاصد، پس منظر اور اس جدوجہد سے برآمد ہونے والے نتائج پر گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''ان ساری قومی وبین الاقوامی آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیوبند تھا، جس کے فضلا نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی، سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اُتر کر تحریکات کے ذریعے اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی۔ اور 1857ء ہی سے پھونکنی شروع کردی تھی، جب کہ ملک کے دوسرے حلقے خوف زدہ اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں نے غاصب انگریزوں کا مقابلہ ابتداءً آہنی تلوار سے کیا۔ پھر امن اور علم کی ناقابل شکست طاقت سے (کے ذریعے) نبرد آزما ہوئے۔ اور علمی رنگ سے یہ جذبات، دوررس ثابت ہوئے۔ اور آزادی کی لہریں دُور دُور تک پھیلیں، جس سے اس جامعہ کے مؤسس فضلا اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔'' (14)

موصوف ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کی تحریک کا جامع نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا، بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خود مختاری، حق خودارادیت، معاشی استغنا، وسائل قوت کی فراہمی، رابطہ عوام وغیرہ کے ملے جلے جذبات کارفرما تھے۔'' (15)

دارالعلوم دیوبند کے یہ مقاصد کسی عام آدمی کے بیان کردہ نہیں ہیں، بلکہ واقفِ حال، بانی دارالعلوم کے پوتے اور ایک عرصہ تک دارالعلوم کے مہتمم رہنے والے کے ہیں۔ مولانا قاری محمد طیبؒ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔ فرق تیغ وسناں (16) وقلم وزبان کا تھا۔ وہاں جنگ کے ساتھ آزادیٔ ملک وملت اور آزادیٔ مذہب ودین کا نصب العین سامنے تھا۔ اور یہاں عدمِ تشدد کے ساتھ علمی، اَخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا۔ وہاں اس نصب العین کے لیے افراد استعمال کیے جارہے تھے۔ اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے۔ وہاں نام میدان جنگ کا تھا۔ اور یہاں نام مدرسہ ومکتب اور امن وصلح کا تھا۔ وہاں قلب ودماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کررہے تھے۔ اور یہاں براہِ راست دل ودماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔''

غرض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے میدانِ شاملی کے نتائج پیش رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اور اس

کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز پر اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو۔ اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکا وہ اب ہوجائے۔(17)

گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا۔ صرف رُخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔ یہی علما جو 1857ء کے بعد ان اصولوں کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں خاموش بیٹھ گئے تھے۔ وہ بالآخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چاروناچار ان کے کارآمد ہونے کو تسلیم کرلیا گیا۔ اور پھر عوامی تحریکات اکثر وبیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔ بانی دارالعلوم کو آزادی پسند علمی حکمت عملی کی کامیابی پر اس قدر اعتماد تھا کہ ایک موقع پر مسجد چھتہ، جسے بعد میں دارالعلوم کی شکل دی گئی، اس کے اہم اراکین میں سے ایک اساسی رکن حاجی محمد عابد صاحبؒ نے جب اپنے اس خدشے کا ذکر کیا کہ:

''اب ہندوستان کی حکومت، انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کی آزادی بظاہر ممکن نظر نہیں آتی۔''

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے کمالِ خود اعتمادی سے فرمایا:

''حاجی صاحبؒ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں۔''(18)

چنانچہ اسی (80) سال کے بعد 15 اگست 1947ء کو ایسا ہی ہوا۔ دارالعلوم کے قومی سیاسی کردار کی اہمیت کو ہند کے تمام باشعور حلقے تسلیم کرتے ہیں۔ چناں چہ دارالعلوم دیوبند کے صدسالہ جشن (1980ء) کے موقعے پر ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے اجتماعِ عام میں کہا تھا کہ: ''ہندوستان کی آزادی میں دو اداروں کا بنیادی کردار ہے: ایک کانگریس اور دوسرا دارالعلوم دیوبند۔''(19)

اکابرین دارالعلوم نہ صرف علمی میدان کے قائد تھے بلکہ وہ امورِ انتظامی میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دارالعلوم کے جلسے کے موقعے پر مولانا فریدالدینؒ (جو سید احمد شہیدؒ کے رفقا میں سے تھے) کے فرزند شاہ رفیع الدینؒ نے جو دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں، نے ایک اجتماع کے بہت اچھے انتظامات کیے تو احباب نے اسے سراہا تو اس پر کہنے لگے:

''یہ تو خیر جلسہ ہی ہے۔ ہم کو تو اگر سلطنت بھی سپرد کردی جائے تو انشاء اللہ اس کا بھی ایسی ہی سہولت واطمینان اور حسن وخوبی کے ساتھ انتظام کرکے دکھلادیں۔''(20)

اس دارالعلوم کے پہلے طالب علم محمود حسنؒ تھے، جو بعد میں دنیا کے اُفق پر ''شیخ الہند'' بن کر چھاگئے۔

شیخ الہندؒ کی تعلیم:

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ۱۲۶۸ھ/ 1851ء (21) میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ مولانا ذوالفقار علیؒ ان نفوسِ قدسیہ میں سے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ کے ممتاز رکن تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنیؓ سے جاملتا ہے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ ابتدائی کتابوں سے آگے بڑھے تو انھیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سپرد کر دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا قیام اس وقت میرٹھ میں تھا اور منشی ممتاز علی کے مطبع میں ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ 1867ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو حضرت شیخ الہندؒ دیوبند تشریف لائے۔ اور دارالعلوم میں داخل ہوگئے۔ اور مولانا محمودؒ عرف ملاں محمود، مولانا محمد یعقوبؒ ابن حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ اور سید احمد دہلویؒ سے علوم کی تکمیل کی۔ اور 1873ء میں تحصیل علوم سے فارغ ہوئے۔(22)

مسند تدریس:

دارالعلوم ہی میں تدریس کا سلسلہ آپ نے اسی وقت سے شروع کر دیا، جب آپ آخری کتابیں پڑھ رہے تھے۔ جب کہ فراغت کے بعد 1874ء میں معاون مدرّس کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا، لیکن ایک سال تک آپ نے اس خدمت کی کوئی تنخواہ نہیں لی۔ اس سے اگلے سال مدرسِ چہارم کی حیثیت سے آپ کو متعین کیا گیا اور پندرہ روپے وظیفہ مقرر ہوا۔ بعد ازیں آپ عہدۂ صدر مدرس پر فائز ہوئے، جس کی نوعیت سمجھنے کے لیے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے یہ الفاظ توجہ طلب ہیں:

> ''دارالعلوم کا عہدۂ صدارت تدریس محض مدرسی کا عہدہ نہیں، بلکہ رہنمائی و رہبری کا عہدہ رہا ہے۔ جس پر آنے والے کے علمی اثرات سے قلوب متأثر و مستفید رہتے آئے ہیں، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ رہبری، فقہ کے کسی خاص مکتبۂ فکر یا تصوف کے کسی خاص سلسلۂ رُشد وہدایت کی نہ تھی۔ نہ کسی خانقاہ کی سرپرستی یا کسی صاحبِ سلسلہ کی خلافت سے حاصل ہوتی تھی۔ دارالعلوم کے عہدۂ صدر مدرس کو کسی کالج کی پرنسپل شپ یا کسی جامعہ کی وائس چانسلر شپ سے بھی مماثل قرار نہیں دینا چاہیے، کہ محض تعلیم و تدریس میں رہنمائی ونگرانی اور چند انتظامی امور کی انجام دہی سے اس کا تعلق ہو۔(23)

کیوں کہ دارالعلوم نہ محض ایک رسمی درسگاہ تھی، نہ کوئی روایتی خانقاہ، بلکہ دارالعلوم، اسلام کے احیا اور مسلمانوں کی زندگی کے قیام اور سیاسی آزادی کی تحریک کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ دارالعلوم بیک وقت دینی و سیاسی تعلیم گاہ اور تربیت کا مرکز تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے علومِ دینی اور سیاست کی تعلیم بھی

حاصل کی تھی اور تربیت بھی پائی تھی۔ اب اس تحریک کے مجاہدوں کی تعلیم وتربیت دینی وسیاسی کی ذمہ داری آپ پر تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا پڑھانے کا طریقہ بالخصوص حدیث اور فقہ کے مختلف اقوال کو بیان کرنے اور ان میں تطبیق اور ترجیح دینے کا وہی طریقہ تھا، جو ہندوستان کے نامی گرامی علمی خاندان حضرت امام شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کا تھا۔ (24) حضرت شیخ الہندؒ کی تعلیم وتربیت کا کوئی ایک بندھا ٹکا انداز اور سانچا نہ تھا، جس میں کسی خاص ذوق اور مخصوص قسم کی سیرتوں کو ڈھال دیا جاتا تھا۔ حضرت کی تربیت کا کمال یہ تھا کہ ہر طالب وشائق کو اس کے ذوق کے مطابق درس وتدریس، وعظ وتبلیغ، سلوک وطریقت، تالیف وتدوین، علوم ومعارف، حکمت، فلسفہ وسیاست اور قومی وملی خدمات کے میدان میں تربیت سے باکمال اور صرف ہمت سے بے مثال اور نادر بنادیا تھا۔ (25) آپ کی تدریس، خشک اور جامد زہد وتقویٰ کی تلقین نہیں کرتی تھی، بلکہ آپ کی تربیت سے نہ صرف فخر روزگار دانش مند تیار ہوئے، بلکہ وہ حریت پسندی و جہادِ آزادی کے سرفروش قافلہ کے سالار بھی تھے۔ آپ نے ایسے حضرات کو پیدا کیا، جو آسمانِ علم وسیاست کے روشن ستارے مانے جاتے ہیں۔

انجمن ثمرۃ التربیت:

حضرت شیخ الہندؒ نے دوران تعلیم جہاں اپنے استاد کے علوم کو حاصل کیا تھا، اس کے ساتھ اس نظریے اور سیاسی جدوجہد کے مقاصد کو بھی گہرائی سے سمجھا تھا، جس کے لیے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ایک طرف تو دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دیدہ ور علما اور مفکر فضلا پیدا کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف ان علما اور فضلائے دیوبند کے اندر حریت اور آزادیٔ ہند کے شعلے اندر ہی اندر بھڑکا رہا تھا۔ یہ حریت کے شعلے جو جہاد کی شکل میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سینے میں بھڑک رہے تھے۔ ان سے منتقل ہوکر ان کے شاگردوں کے سینوں میں جا بھڑکے۔ خاص طور پر مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا وغیرہ کے سینے میں۔ اور پھر یہ آگ بن کر دُھول کی طرح تمام علمائے حریت پسند کے سینوں میں بھڑکی۔ (26) دارالعلوم کے قیام پر ابھی ایک دہائی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ 1878ء میں اس تحریک کے مجاہدوں کی تعلیم وتربیت، اسے تنظیمی ڈھانچہ دینے اور سیاسی امر کی ادائیگی کی ذمہ داری آپ نے سنبھال لی۔ چناں چہ دارالعلوم سے فراغت پانے والے اور اپنے ساتھ منسلک طلبا کی سیاسی تربیت کے مقصد کے پیش نظر آپ نے اپنے استاد جلیل مجاہدِ حریت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایما پر فضلا اور بہی خواہان تحریک دارالعلوم کی ایک انجمن ''ثمرۃ التربیت'' کے نام سے قائم کی۔

اس جمعیتِ عظمیٰ میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ اٹھارہ اور مرکزی ارکان تھے، جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

1۔ مولانا احمد حسن امروہویؒ 2۔ مولانا فخر الحسنؒ گنگوہی

3۔	مولانا عبدالحق پرقاضوپیؒ	4۔	مولانا محمد فاضل دیوبندیؒ
5۔	مولانا میر محمد صادقؒ، مدراس	6۔	مولانا عبدالقادر دیوبندیؒ
7۔	مولانا فتح محمد تھانویؒ	8۔	مولانا عبداللہ انبیٹھویؒ
9۔	مولانا محمد مرادؒ، ساکن پاکپتن	10۔	مولانا عبداللہ گوالیاریؒ
11۔	مولانا عبدالعلی عبداللہ پوری میرٹھیؒ	12۔	مولانا نہال احمد دیوبندیؒ
13۔	مولانا عبداللطیف سہارن پوریؒ	14۔	مولانا عبداللہ جلال آبادیؒ
15۔	مولانا محمد اعلیٰ انبیٹھویؒ	16۔	مولانا محمد عبدالعدل پھلتیؒ
17۔	مولانا کوثر نگینویؒ	18۔	مولانا کرامت اللہ دہلویؒ (27)

انجمن ثمرۃ التربیت کا مقصد:

اس انجمن کا مقصدِ اصلی کیا تھا؟ اس حوالے سے مؤرخ تحریکِ آزادی مولانا محمد میاںؒ کا یہ تجزیہ لائق مطالعہ ہے کہ:

''1878ء سے تقریباً چالیس سال بعد (1915ء تا1923ء) احقر (مولانا سید محمد میاںؒ) نے دارالعلوم سے استفادہ کیا۔ اس وقت دارالعلوم کے ذہین اور ترقی پذیر طلبا کے جذبات یہ تھے کہ انگریز کی غلامی سے گلوخلاصی ایک خوددار مسلمان بالخصوص حاملین دین کا فرض اولین ہے۔ طلبا اسی جذبہ کو نمودِ زندگی اور جوہر حیات سمجھتے تھے۔ اپنی فہم کے مطابق اس جذبے کی جلوہ آرائی کے لیے اپنے دماغوں میں نقشے بناتے۔ اور متحرک قسم کے طلبا پارٹی کا ڈھانچہ بھی تیار کر لیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے طلبا کی یہ سوچ شروع دن سے ہی تھی۔ اور دارالعلوم کے طلبا میں یہ جذبات سینہ بسینہ چلے آ رہے تھے۔''

چناں چہ سید محمد میاںؒ حضرت شیخ الہندؒ کے دور کے طلبا کے احوال کے تذکرے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''مولانا محمود حسنؒ جن طلبا کے رفیق اور ہم درس تھے، ان کا نظریہ، یہ تھا کہ یہ دارالعلوم اسی لیے قائم کیا جا رہا ہے کہ ایسے مردانِ کار پیدا کیے جائیں، جن کے ذریعے 1857ء کی ناکامی کی تلافی ہو سکے۔''

شیخ الہندؒ اپنے استاد کے تلمیذِ خاص اور ہمراز رفیق تھے۔ لہٰذا آپ تحریکِ دارالعلوم دیوبند کے اصلی منشا سے بخوبی واقف تھے۔

اس پس منظر کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ ''ثمرۃ التربیت'' سے فضلا و متبعین دارالعلوم کی تنظیم ہی مقصود نہیں تھی بلکہ اصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھا، جو قیام دارالعلوم کے مقصد یعنی 1857ء کی غلامی کی تلافی کے سلسلہ میں کام کر سکیں۔

www.rahimia.org

مگر اس انجمن کو قائم ہوئے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ ۱۲۹۷ھ/ 1880ء (28) میں قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ انتہائی کم عمری یعنی 50 سال سے کم عمر میں ہی انتقال کر گئے۔ یہ حادثہ جانکاہ مستقبل کے شیخ الہندؒ کو کمر ہمت باندھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور آپ ثمرۃ التربیت کی تمام تر ذمہ داری سنبھال لیتے ہیں۔

استاد و مربی کے مشن کا فروغ:

شیخ الہندؒ کا اصل کام کیا تھا۔ مولانا انظر شاہ مسعودیؒ تحریر کرتے ہیں:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک ہمہ گیر تحریک کی بنیاد نئے تقاضوں کے مطابق جس انداز پر کی اور اس کاروانِ جہاد کو برابر پیش قدمی کے لیے جو سپہ سالارِ اعظم دیا، اس کا نام نامی ''مولانا محمود حسن المعروف بہ شیخ الہندؒ'' ہے۔ فرق اتنا ہے کہ دماغ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تھا۔ اور آپ ہی کا فکر لیکن نئے حالات، نئے ماحول اور نئی فضا میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان آتشینِ جذبات کو انگھیٹیوں میں محفوظ رکھنے کے بجائے شعلے ان دل و دماغ میں بھی منتقل کرنا شروع کر دیئے، جواب تک فرنگی ظلم و استبداد کی شدید گرفت کی وجہ سے کسی جدوجہد کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔(39)

شیخ الہندؒ اپنے استاد کے مشن کو بامِ عروج اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور متواتر تیس سال تک آزادی کے متوالوں کی تربیت میں پوری ہمت اور مکمل رازداری کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے یوں یہ تحریک اپنے مقصد حقیقی کی طرف گامزن رہی۔ اور ان چنیدہ افراد کے سینوں میں حریت اور مکمل آزادی کا شعور اور جذبہ بیدار کرتی رہی۔ اس انجمن کی سرگرمیاں اگرچہ رُکی ہوئیں نظر آتی تھیں، لیکن قبائلی علاقوں میں حضرت شیخ الہندؒ ان علاقوں سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے (30) چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو جو ۲۰ر جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ/ 31 جنوری 1891ء بروز ہفتہ میں دارالعلوم سے فارغ ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ ۱۳۱۵ھ/ 1898ء میں دیوبند طلب فرمایا۔ اور اس وقت کے حالات کے پیش نظر علمی کام کے ساتھ ساتھ سیاسی کام کرنے کی بھی تلقین فرمائی۔ اور ان کو اپنی تحریک کا ایک اہم رُکن منتخب کر لیا۔ اس کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت شیخ الہندؒ کا سیاسی پروگرام لے کر اپنے وطن پہنچے۔ اور اپنی عملی زندگی کا آغاز ''گوٹھ پیر جھنڈا'' حیدرآباد میں ''دارالرشاد'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر کے کیا۔ اور سات سال تک اس مدرسے کی نگرانی کرتے رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں سندھ کے گرد و نواح میں آزادیٔ ہند کے لیے خفیہ طریقے سے کام جاری تھا، جس کی قیادت سرزمین سندھ و جنوبی پنجاب کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرما رہے تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی اس تحریک سے منسلک ہو گئے تھے، کیوں کہ حضرت مولانا محمد صدیق بھرچونڈیؒ کی وفات کے بعد حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ آپ کے پیر و مرشد تھے، لیکن

۱۳۱۰ھ کے بعد جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تعلق تحریکِ شیخ الہندؒ سے ہوا تو انھوں نے سندھی تحریکِ جہاد کو تحریکِ شیخ الہندؒ کے ساتھ مربوط کرکے حضرت شیخ الہندؒ کو زبردست سیاسی قوت سے ہم کنار کیا۔ حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان تعلق پیدا کرنے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے عظیم الشان کردار ادا کیا۔ اسی طرح امروٹ میں حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ اسی اسپرٹ کے ساتھ تحریک آزادی کو فروغ دے رہے تھے۔ اوراس مرکز کا بھی دارالعلوم دیوبند سے مسلسل رابطہ تھا۔

قیام سندھ کے زمانے میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا خفیہ رابطہ برابر دیوبند سے رہا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ سے برابر مشورہ لیتے رہے۔ اور ایک مرتبہ اپنے مدرسے میں امتحان لینے کے بہانے سے حضرت شیخ الہندؒ کو سندھ کا دورہ کرایا۔ اور یہاں پر ہونے والے کام سے متعارف کرایا۔ (31)

جمعیۃ الانصار:

حضرت شیخ الہندؒ کے نزدیک دینی و سیاسی دونوں قسم کی تعلیم وتربیت کی ضرورت اور اہمیت تھی۔ دینی تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے سب سے اول دارالعلوم دیوبند تھا۔ اور دوسرے شہروں میں بہت سے چھوٹے بڑے مدارس یہ خدمت انجام دے رہے تھے، لیکن سیاسی تعلیم وتربیت کا انتظام اس طرح نہ تھا۔ ملک میں کوئی سیاسی تنظیم اور جماعت موجود نہ تھی جس کی عملی جدوجہد سے مسلمانوں کی ذہنی وفکری رہنمائی اور عملی تربیت کی ضرورت کسی نہ کسی حد تک پوری ہوتی رہتی۔ اگر دارالعلوم میں مصروف تعلیم طلبا ہی کی سیاسی تعلیم وتربیت پر اکتفا کرلیا جاتا تو ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا، جب کہ ملکی حالات کا تقاضا دوسرا تھا۔ اس لیے ایک درس گاہ کی حدود سے زیادہ وسیع حلقہ میں اپنے افکارِ سیاسی کی اشاعت اور حلقہ تلامذہ کے علاوہ سیاسی رجحان وفکر رکھنے والے نوجوانوں کی سیاسی تعلیم وتربیت بھی حضرت شیخ الہندؒ کے پیش نظر تھی۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے آپ نے 1878ء میں ثمرۃ التربیت کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ اس کے بعد 1919ء میں جمعیۃ الانصار کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس کے ناظم تھے۔ (32)

دراصل جمعیۃ الانصار، انجمن ''ثمرۃ التربیت'' ہی کا نیا لیبل اور عنوان تھا، جس کی تائید مولانا محمد میاںؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے:

> ''1907,8ء کا ہنگامہ خیز دور (33) جس میں بقول سرڈیزل بٹس لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے۔ ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی۔ وہ منتظر تھے کہ ثمرۃ التربیت کے نام سے قائم اجتماعیت اور جدوجہد کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ زمانہ حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کی جماعت کے لیے ایک حیات بخش دور تھا، جس کی تمہید خفیہ طور پر ثمرۃ التربیت کے قیام کے ذریعہ تین دہائی پیشتر کی

جا چکی تھی چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق 1909ء میں اس کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا۔ اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کی مقبولیت بھی اسی طرح ہمہ گیر ہوئی ہے۔'' (34)

اس جماعت کی تاسیس کے حوالے سے مولانا سید محمد میاںؒ لکھتے ہیں:

''اکابر سے باوثوق طور پر سنا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس تحریک سے بیشتر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت نانوتویؒ کے شاگردِ رشید حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جمع کر کے زمانے کی موجودہ ضرورتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو ضعفِ قلب کا عذر پیش فرمایا۔ اور باقی سب حضرات نے موافقت فرمائی۔ (35)

اس اہم ترین جماعت کی تنظیمی ذمہ داری سنبھالنے کا شرف حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو حاصل ہوتا ہے، جنہیں حضرت شیخ الہندؒ نے سندھ سے بلا کر یہ فریضہ سونپا۔ چناں چہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ ذاتی ڈائری میں خود تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۲۷ھ بمطابق 1909ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا۔ اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ میں چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا، اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق سندھیؒ، مولانا ابومحمد لاہوریؒ اور عزیزی مولانا احمد علی لاہوریؒ میرے ساتھ شریک تھے۔'' (36)

جمعیۃ الانصار کے سرپرستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ تحریر کرتے ہیں:

''۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ/ 23 اپریل 1910ء بروز ہفتہ کو دیوبند میں جلسہ ''اجماع الانصار'' منعقد ہوا، جس میں علاوہ 30 اراکین جمعیت کے استاذ العلما حضرت مولانا محمود حسن مدظلہ، صاحبزادہ عالی جاہ مولانا مسعود احمد گنگوہی سلمہ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری مدظلہ، جناب حافظ محمد احمد اللہ مہتمم مدرسہ عالیہ، جناب مولانا حبیب الرحمٰن مددگار مہتمم مدرسہ عالیہ، سرپرستان جمعیۃ الانصار بھی شامل ہوئے۔'' (37)

دارالعلوم دیوبند کا جلسہ دستار بندی:

جمعیۃ الانصار کو عام ذہنوں تک پہنچانے کے لیے مناسب سمجھا گیا کہ سب سے پہلے خالص مذہبی پیرائے میں اس کا ظہور ہو، جو اس وقت کی سیاست کے لحاظ سے نہایت ہی مدبرانہ اقدام تھا۔ اور تعلیمی اداروں کی روایت کے

مطابق بھی تھا۔ چناں چہ ۱۳۲۸ھ/ 1910ء میں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام دارالعلوم دیوبند میں کیا گیا، جس میں ہندوستان کے اطراف واکناف سے تقریباً تیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ یہ اجتماع اس زمانے تک ہندوستان کی کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس اجتماع کو اور پھر اس سے زیادہ اس کے حسن انتظام کو کرامت خیال کیا گیا، مگر جن حضرات کی نظر اس کے ستائیس، اٹھائیس سال قبل کے آغاز پر تھی، وہ اس پر اس قدر تعجب نہ کرتے تھے۔ اگرچہ کام یابی پر بہت زیادہ مسرور تھے۔ (38)

اجتماع میں ہر طبقے کے لوگوں نے شرکت کی۔ ان میں ایک قابل ذکر تعداد ان لوگوں کی تھی جو ثمرۃ التربیت کے قیام کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں شامل ہوگئے تھے۔ ان کو اس جلسے کے ذریعے مل بیٹھنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس جلسے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جمعیۃ الانصار کا تعارف، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے والے طلبا کی صالح اجتماعیت اور تنظیم کے طور پر ہوگیا۔

حضرت شیخ الہندؒ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ:

حضرت شیخ الہندؒ کی دینی بزرگی اور سیاسی رہنمائی کا اعتراف مذہبی حلقے ہی میں نہیں کیا گیا، بلکہ سیاست کے دوسرے مکتبہ فکر یعنی علمائے علی گڑھ کے اکابر نے بھی کیا ہے۔ چناں چہ مذکورہ بالا اجتماع میں تحریک علی گڑھ کے اکابر بھی شریک ہوئے۔ اس جلسے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر قرار پائے، نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ، علی گڑھ کالج میں انگریزی پڑھنے جایا کریں۔ اور علی گڑھ کے گریجوایٹ دینی تعلیم کے لیے دیوبند آئیں۔ یہ تجویز نہایت مبارک خیال کی گئی۔ اگرچہ اس کا ثمرہ نہایت تلخ تھا۔ یعنی پہلی مرتبہ جو طلبا علی گڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لیے آئے، وہ انگریز کے سی آئی ڈی تھے، جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرانے میں اپنے تئیں ''وطن دوستی اور قوم پروری کا حق'' ادا کر کے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کا عہدہ حاصل کرلیا۔ (39)

جلسہ مراد آباد:

اس کے بعد اپریل 1911ء میں شہر مراد آباد میں جمعیۃ کا پہلا باقاعدہ اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردِ خاص اور شیخ الہندؒ کے رفیق قدیم) حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ نے فرمائی۔ جلسے میں مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے دین اور زعمائے ملت نے شرکت فرمائی۔ یہ جلسہ نہایت تزک واحتشام کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ مولانا سید محمد میاںؒ اس جلسے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جلسہ دستار بندی فضلائے دیوبند سے فراغت کے بعد جمعیت الانصار کے اجلاس کی تیاری کی گئی۔ جمعیت الانصار کا سب سے پہلا اجلاس ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق 15، 16، 17 اپریل 1911ء

کو مراد آباد میں ہوا۔اس جلسے کا اجتماع بھی حیرت انگیز تھا۔ اور باوجود یکہ شہر میں طاعون کے مرض کی شدت تھی۔ تاہم اجتماع بے نظیر اور انتظام قابل رشک تھا۔ اس اجتماع کی فوری برکت یہ ظاہر ہوئی کہ شہر سے فوری طاعون ختم ہو گیا۔'' (40)

اگر چہ اس کا اہتمام طالبِ علموں نے کیا تھا، لیکن برٹش حکومت سے جمعیۃ کے مقاصد اور شیخ الہندؒ اور ان کے تربیت یافتگان کے مقاصد فکر چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔ رسماً ایک تجویز میں حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا، لیکن مولانا احمد حسن امروہویؒ کا خطبہ صدارت بہت کچھ بتا رہا تھا۔ آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں اس بات کی وضاحت کی کہ جمعیۃ الانصار، دیگر اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ کی اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کی طرح بے مقصد اکٹھ نہیں ہے، بلکہ اس کے قومی اور ملی مقاصد ہیں چنانچہ مولاناؒ فرماتے ہیں:

''نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں۔ جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس سال پہلے شروع ہوگئی تھی۔ اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے، جو آج علوم کے سرچشمہ اور فنون کے آفتاب ہیں۔ اور جن کی ذات بابرکت پر آج زمانہ جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے، لیکن یہ تحریک اس وقت ضروریات سے متعلق نہ تھی۔ اس لیے رُک گئی۔ اور آخر اس کلیہ کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے، 1909ء سے اس انجمن کو دوبارہ زندہ کر کے جمعیۃ الانصار نام رکھا گیا۔ جمعیۃ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے۔ اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے۔ بلکہ اس کے وہ ضروری مقاصد ہیں جن کی آج بہت کچھ ضرورت ہے۔'' (41)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا نے اپنی ہمہ گیر اور منظم تحریک کی ابتداء ثمرۃ التربیت سے کی تھی۔ اور بعد میں از سر نو تنظیم کے لیے جمعیۃ الانصار نام تجویز کیا۔ جلسہ مراد آباد کے بعد جمعیۃ کے پانچ، چھ جلسے ملک کے مختلف حصوں میں ہوئے، جن میں شملہ، میرٹھ، دیوبند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس جمعیۃ کے ذریعے عوام سے رابطہ اور تعلق کی ایک صورت پیدا ہوئی۔ اور مسلم سیاست پر، جو کہ ایک عرصے سے جمود طاری تھا، اس میں کافی حد تک کمی آ گئی۔ تقریباً چار سال تک یہ انجمن باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتی رہی۔ اور لوگوں پر اس تحریک کا مثبت اور مؤثر اثر رونما ہوا۔

لیکن حکومت فرنگیہ کے کان بھی اس نئی تحریک کو دیکھ کر کھڑے ہونے لگے، کیوں کہ انگریز کو معلوم تھا، کہ اس تنظیم کا قائد شیخ الہندؒ اس مجاہد کا تربیت یافتہ ہے، جس نے شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور حکومت وقت کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ اگر یہ تحریک چلتی رہی تو بہت جلد ہی انگریز کو ہندوستان سے در بدر ہونا پڑے گا۔ یہ رپورٹیں حضرت شیخ الہندؒ اور دار العلوم کے منتظمین کو پہنچ رہی تھیں، جس کی بنا پر یہ خدشہ پیدا ہوا

کہ کہیں جمعیۃ الانصار کی وجہ سے حکومت دارالعلوم کو نقصان نہ پہنچادے۔ اتفاق سے اس عرصے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ میں چند علمی مسائل میں اختلاف پیدا ہوگیا، تو حضرت شیخ الہندؒ نے بظاہر ان اختلافات کو بنیاد بنا کر مگر حقیقت میں تحریک کے دائرہ کار کی وسعت کے لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی جانے کا حکم فرمایا۔ اور یوں جمعیۃ الانصار کی نظامت سے آپ سبکدوش ہو گئے، لیکن حضرت شیخ الہندؒ سے مسلسل رابطہ رہا۔ چناں چہ حضرت مدنیؒ لکھتے ہیں: (حضرت سندھیؒ کا) حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق میں (اس واقعے کے بعد) کوئی فرق نہیں آیا۔ خفیہ آمد ورفت جاری رہی۔ رات کی اندھیریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اور ضروری باتیں انجام دی جاتی تھیں۔ (42)

نظارۃ المعارف القرآنیہ:

دہلی پہنچ کر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے 13 جون 1913ء/ ۸ رجب ۱۳۱۳ھ بروز جمعۃ المبارک (43) میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک اجتماعی تربیت کا ادارہ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر قائم کیا، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کرنا اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ حکمت کے مطابق ہندوستان کے معروضی حالات میں سیاسی رہنمائی کرنا تھا۔ حضرت سندھیؒ اس کے ناظم قرار پائے۔ جب کہ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ اور نواب وقارالملکؒ برابر شریک تھے۔ (44) یہ ادارہ بقول حضرت مولانا محمد میاںؒ: ''دردمندانِ حریت کے لیے تعلیم گاہ، تربیت گاہ، جائے اطمینان اور آزادی پسندوں کے لیے خفیہ مشورہ گاہ تھا۔'' (45)

اس مدرسۂ آزادی میں طلبا میں جذباتِ حریت کیسے پیدا کیے جاتے تھے؟ اس کی ایک جھلک مولانا شائق عثمان کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''نظارۃ المعارف دہلی کے دورانِ قیام ہم لوگوں کو کبھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس طرح کا مضمون لکھنے کو دیتے تھے کہ اگر تم کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنادیا جائے تو تم ملک کا نظام کس طرح چلاؤ گے؟'' (46)

دراصل اس حکمتِ عملی کے خدوخال شیخ الہندؒ نے طے کئے تھے، جس کا مقصد دارالعلوم دیوبند سے باہر سیاسی تعلیم وتربیت کا مرکز قائم کرنا تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل اس اجتماعیت سے کیسے کی گئی؟ اس بابت حضرت سندھیؒ کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال اپنے پاس رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا، اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف

لائے۔ اور ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست سے میں واقف رہا۔''(47)

سیاسی حالات میں تبدیلی اور شیخ الہندؒ کا اقدام:

1912ء تک حضرت شیخ الہندؒ کا طریق کار وہی رہا، جس کا اوپر کی سطروں میں تذکرہ ہوا۔ یعنی تعلیم وتربیت دینی وسیاسی سے ایک ایسی جماعت تیار کردی جائے جو قیامِ شرع (شریعت) احیا وتجدید ملت، ملکی سیاست اور آزادی کی جدوجہد میں اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس رکھتی ہو، اوران سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔''(48)

اس مقصد کے حصول کے لیے بلاشبہ نظارۃ المعارف القرآنیہ نے ایک عرصہ اعلیٰ درجہ کی فکری درس گاہ کے انداز میں کام کیا۔ اور متعدد فضلا پیدا کیے، مگر یہ ایسا دور تھا کہ بالغ النظر فضلا اور گہری بصیرت والے دانش ور وہ کام نہیں کرسکتے تھے، جو حضرت شیخ الہندؒ کے نزدیک اس دور کا جوہری کام تھا۔ (49) چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کی اسی بابت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت شیخ الہندؒ دہلی تشریف لے گئے۔ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے ملاقات کی۔ اور دورانِ گفتگو فرمایا کہ جبکہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسے سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے، اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنادیں گے۔''(50)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نظام کے اثرات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ اور باطل نظام ہر اچھی چیز کو ختم یا اس کے اثرات محدود کردیتا ہے۔ اس بنا پر حضرت شیخ الہندؒ انگریز کے اس باطل نظام اور اس کی غلامی سے برصغیر کو جلد از جلد آزادی دلانا چاہتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی اس سوچ کا پس منظر ہندوستان کی غلام حیثیت کے ساتھ بین الاقوامی حالات کی تبدیلی تھی۔ اس ضمن میں دو واقعات جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت افریقہ کے ساحلی علاقوں پر واقع کئی ریاستوں پر برطانیہ اور فرانس نے غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا، مگر بوجوہ طرابلس (لیبیا) ان کے قبضے میں نہ آسکا۔ اٹلی نے برطانیہ اور فرانس سے خفیہ معاہدہ کرلیا کہ جونہی موقع ملے گا، اٹلی طرابلس پر قبضہ جمالے گا۔ اور یہ دونوں ملک خاموش رہیں گے، مگر اس خفیہ معاہدے کے باوجود اٹلی نے اعلانیہ طور پر ہمیشہ یہی کہا کہ اٹلی، طرابلس کو خود مختار دیکھنا چاہتا ہے۔ حقیقت میں یہ سب جھوٹ تھا۔ چناں چہ اٹلی نے اچانک طرابلس پر حملہ کردیا۔ اور 18 اکتوبر 1912ء میں طرابلس پر اٹلی نے بے پناہ خون بہانے کے بعد قبضہ کرلیا۔ اسی زمانے میں برطانیہ نے سازش کرکے بلقان کی ریاستوں کو خلافتِ عثمانیہ

کے خلاف بغاوت پر اُکسایا۔ اور بہت قتل وخون ہوا۔ باوجود یکہ برطانیہ، بلقانی ریاستوں کی حفاظت کے کئی وعدے کر چکا تھا، مگر اس جنگ میں اس نے بہت سفاکانہ رویہ اپنایا۔ اور دیگر یورپی ممالک سے مل کر ان ریاستوں کی بندر بانٹ کی۔

1912ء میں جنگ طرابلس اور کارزارِ بلقان کے سنگین واقعات اور برطانوی پالیسی نے شیخ الہندؒ کی روح کو تڑپا دیا، جس کی وجہ سے برٹش حکومت سے ان کا جذبۂ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ حکومتِ برطانیہ کی خلافتِ عثمانیہ سے دشمنی واضح ہو چکی تھی۔ ترکوں پر ظلم وستم اور ان پر مصیبتوں کی خبروں نے ان کا خواب حرام کر دیا۔ اس زمانے میں ان کی بے چینیوں اور بے قراریوں کا عالم دیدنی تھا۔ ان کا نحیف ونزار جسم بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ انھوں نے دارالعلوم کو بند کر دیا۔ طلبا کے وفود ملک میں بھیجے۔ خود بھی نکلے۔ چندہ جمع کیا۔ اور ترکوں کی امداد کے لیے جو کچھ ہوسکتا تھا کیا۔ ترکی میڈیکل مشن بھجوانے کا انتظام کیا۔ اور اس کے لیے اسباب مہیا کرنے اور اسباب کی فراہمی کا انتظام کیا۔ بقول مولانا حسین احمد مدنیؒ: ''مولانا نے تھوڑی مدت میں بہت کچھ کام یابی حاصل کر لی۔ اور کام کرنے والوں کے لیے شاہراہِ عمل قائم کر دی۔ (51)

مذکورہ بالا حالات اور پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر ہر مسلمان کا دل رو رہا تھا۔ پورے عالم میں ایک سنسنی تھی۔ حزن وملال کے بادل محبانِ وطن کے دلوں پر چھائے ہوئے تھے۔ اب 1914ء میں جنگِ عظیم اول چھڑ گئی۔ اور برٹش حکومت پر ضرب لگانے اور آزادی کی منزل کو قریب لانے کے لیے امید کی ایک کرن نظر آنے لگی۔ یہ حالات اس بوریہ نشین، ہند کے عظیم ترین انقلابی قائد اور مستقبل کے شیخ الہندؒ پر بھی اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ:

> ''دیکھنے میں لاغر ونحیف تھا، مگر سینے میں صبر واستقامت کا ایک کوہِ گراں رکھتا تھا۔ بظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھا، لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل ونہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے بھی شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا، لیکن اس کے درد وگداز اور جذب وسوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں اور جلوتوں میں، رات کی تاریکیوں اور دن کے اُجالوں میں کبھی جنگِ بلقان وطرابلس کے واقعات پڑھ کر آنسو بہاتا تھا۔ اور کبھی اپنے ملک کی زبوں حالی ودرماندگی پر نوحہ کناں ہوتا تھا۔'' (52)

شیخ الہندؒ کا منصوبۂ آزادی:

ان حالات کے رونما ہونے سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کا یہ منصوبہ تھا کہ تحریک کے نمائندے اپنی اپنی جگہ پہنچ کر دینی مدرسوں کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ اور ساتھ ہی عوام الناس میں جذباتِ حریت کو اُبھارتے رہیں۔ اور

افرادی، مالی اور عسکری وسائل کے لیے کوشاں رہیں۔ تا آں کہ میدان بالکل ہموار ہوجائے۔ اور ہر طرف سے حمایت کی اُمید یقینی ہو جائے تو ایک تاریخ میں یک لخت پورے ہندوستان میں بغاوت کردی جائے۔ اور کسی دوسرے ملک کی مدد سے یا غستانی آزاد قبائل کی طرف سے ملک پر حملہ کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک طویل زمانہ انتظار کی ضرورت تھی، لیکن خدا کا کرنا کہ مندرجہ بالا واقعات سے پورے ملک میں بیداری کی ایک لہر پھیل گئی۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہوجانے کی وجہ سے انگریز کو کسی بھی طریقے سے نقصان پہنچانا ضروری ہوگیا۔ لہٰذا تحریکِ جہاد فوراً شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ (53)

یاغستان میں آزاد، منظّم حکومت کی ضرورت:

حضرت شیخ الہندؒ نے موجودہ صوبہ سرحد میں قائم حریت پسندوں کے مرکز یاغستان کو جہاں مولانا سیف الرحمٰنؒ، حضرت حاجی ترنگ زئیؒ وغیرہ حضرات موجود تھے۔ حاجی ترنگ زئیؒ کا اصل نام حاجی فضل واحد تھا، جو حضرت مولانا نجم الدینؒ ہڈے ملا، خلیفہ حضرت اخوند مولانا عبدالغفور سواتیؒ کے خلفا میں سے تھے۔ یہ حضرات عرصے سے جماعت کی ضروریات کو پورا کررہے تھے۔ ان کو پیغام بھیجا کہ اب سکون کے ساتھ کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ سربکف ہوکر میدان میں آجانا چاہیے۔ وہاں سے جواب آیا کہ جب تک کسی آزاد حکومت کی پشت پناہی اور امداد حاصل نہ ہوگی، ہماری شجاعت اور جان بازی بیکار ہے۔ اس لیے آپ کسی حکومت کی امداد اور پشت پناہی حاصل کرنے کا انتظام کیجیے۔ اور آپ خود یہاں تشریف لے آیئے۔ (54)

ان آرا کی روشنی میں حکمتِ عملی طے کرنے اور اس پر عمل درآمد کی نوعیتوں کے جائزے کے لیے غور وفکر شروع کردیا گیا۔ تاہم موجود حالات کے پیشِ نظر مناسب جانا گیا کہ یاغستان میں مرکز قائم کردیا جائے۔ اور سرِ دست جس حد تک ممکن ہو، جدوجہد کا آغاز کردیا جائے۔ چناں چہ ''یاغستان'' کے موضع ''زیکی'' ریاست ''باجوڑ'' میں تحریک کا مرکز قائم کیا گیا۔ اور حاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰنؒ کابلی کی قیادت میں انگریزی استعمار کے خلاف عملی تحریک کا آغاز ہوا۔

حضرت مولاناؒ کی اسکیم یہ معلوم ہوتی تھی کہ سرحد کے قبائلیوں میں جہاد کی روح پھونکی جائے۔ اور اس طرح مجاہدین کی ایک زبردست فوج تیار کی جائے۔ چناں چہ چند علما وہاں بھیجے گئے، جو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے۔ اور قرآن پاک کی شرح میں جو جہاد کی تعلیم ہے اور جس سے ایک زمانے سے علما صرف گزر جاتے (صرفِ نظر کرجاتے) تھے، اس پر سب سے زیادہ زور دینا طے تھا۔ انجام یہ ہوا کہ قبائلیوں میں زبردست جوشِ جہاد بھر گیا۔ اور وہ انگریزوں کے سخت مخالف ہوگئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک قبائلی اپنے پانچ سال کے بچے کو پستول کھیلنے کے لیے دے دیتا تھا۔ اور کام سے لوٹ کر آتا تو پوچھتا تھا کہ: ''اے میرے بچے! آج تو نے کتنے انگریز مارے؟'' وہاں

اسلحہ خانہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ رائفلیں اور پستول وہ لوگ خود بناتے تھے۔ (55)

حریت پسندوں میں جان بازی اور جگر کاری کا جذبہ بے انتہا تھا، لیکن انھیں کسی حکومت کی امداد حاصل نہ تھی۔ کوئی ملک اس کی پشت پر نہ تھا۔ ہندوستان سے حضرت شیخ الہندؒ ان کی مالی امداد کے فرائض بھی انجام دیتے تھے یا ملک کے دوسرے حصوں سے علما اور اہل دل انفرادی اور خفیہ طور پر مدد پہنچاتے، لیکن یہ تمام امداد اور چندے بھی ضرورت کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ مجاہدین جی توڑ کر لڑتے تھے، لیکن کھانے کا سامان ختم ہو جاتا تو انھیں مورچہ چھوڑ کر رَسد کے لیے دور دراز گاؤں میں جانا پڑتا، کارتوس ختم ہو جاتے تو بھی ان کے حصول کے لیے انھیں مورچہ چھوڑنا پڑتا۔ ان حالات میں برطانوی حکومت پر کوئی کاری ضرب نہ لگائی جا سکتی تھی۔ (56)

ان حقیقی مجاہدین کی اس حالت زار کا موجودہ دور کے ان آلہ کار مجاہدین سے موازنہ کیجئے، جو باقاعدہ اور بھاری ماہانہ تنخواہ کے ساتھ بیش قیمت اسلحہ، ٹرانسپورٹ، لاسلکی (وائرلیس) نظام اور جدید سیٹلائیٹ سہولتوں سے آراستہ ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز اور مولانا سندھیؒ کا سفر کابل:

حضرت شیخ الہندؒ نے ان تمام باتوں کا اندازہ کر کے اس دور کی جائز بین الاقوامی حکومت خلافت عثمانیہ (جس سے ہندوستان کی وہ مسلم حکومت سرپرستی کے رشتہ میں منسلک رہی تھی۔ جس کے خلاف انگریزوں نے بغاوت کر کے اسے ختم کر دیا تھا) سے امداد حاصل کرنے کی غرض سے اپنے سرگرم شاگرد حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجنے کا ارادہ کیا، تاکہ وہ حکومتِ افغانستان کو انگریز کے خلاف نبرد آزما ہونے پر آمادہ کریں۔ اور خود حجازِ مقدس جا کر ترکی زعما سے ملاقات کے ذریعے حریت پسندوں کی امداد کا کوئی مستقل بندوبست کرنے اور حریت پسندوں کے مرکز یا غستان پہنچ جانے کا منصوبہ تیار کیا۔ آپ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دہلی سے طلب فرمایا اور حد درجہ راز داری برتتے ہوئے، بنا کوئی مفصل پروگرام بتائے کابل جانے کا حکم دیا۔ حضرت سندھیؒ خود فرماتے ہیں:

> 1915ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی، لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل وکرم سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندے تھے، اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل کے لیے تیار ہے۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اَشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ (57)

الغرض حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کئی مہینے مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے، خفیہ طریقے سے 15 اگست 1915ء (58) یعنی آزادیٔ ہند سے ٹھیک 32 سال پہلے افغانستان کی سرحد میں داخل ہو کر قندھار سے ہوتے

ہوئے کابل پہنچے۔ جہاں تحریک کے خفیہ ممبران آپ کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔ وہاں پہنچ کر آپ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ اسی زمانے میں برطانوی حکومت نے ایسے تمام افراد کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا جن سے انھیں غیر مشروط تعاون و امداد اور ان کی پالیسی کی مکمل حمایت کی بجائے مخالفت اور برٹش حکومت کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے، کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے اور ملک میں انتشار پھیلانے کا خطرہ تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے مذکورہ منصوبے کے لیے یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ اگر وہ گرفتار ہوجاتے تو سارے منصوبے پر پانی پھر جاتا۔ برٹش حکومت اپنے اس ارادے کی تکمیل میں یکسو تھی۔ چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر حکومتِ ہند آپ کو گرفتار کرانے کا مکمل ارادہ کر چکی تھی، جس کی اطلاع ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کو دے دی تھی۔ اس لیے حضرت شیخ الہندؒ پہلی فرصت میں برطانوی قلم رَو سے نکل جانا چاہتے تھے۔ اتفاق سے حج کا زمانہ قریب تھا۔ موقعے کو مناسب سمجھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے حج کے عنوان سے سفرِ حجاز کا قصد فرما لیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے خود ہی مصارف ادا کر دیے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ اپنے جاں نثار خادموں مولانا عزیر گلؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ وغیرہ کے ساتھ حجازِ مقدس کے لیے روانہ ہوگئے۔ ادھر ان کی گرفتاری کا وارنٹ نکلا۔ اور بمبئی پولیس کو تار کے ذریعے گرفتاری کا حکم پہنچا۔ مگر عقیدت مندوں کے ہجوم اور خلقت کے اژدہام کی وجہ سے پولیس انھیں گرفتار کرنے سے قاصر رہی، کہ کہیں بلوہ نہ ہوجائے۔ اسی طرح اگلے اسٹیشنوں پر تار بھیجا جاتا رہا۔ مگر ہر جگہ عقیدت مندوں کے جمع ہونے کی وجہ سے پولیس گرفتار نہ کر سکی۔ پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا۔ مگر جہاز پر یہ تار اس وقت موصول ہوا جب حضرت شیخ الہندؒ جزیرہ سعد میں قرنطینہ کے لیے اتر چکے تھے۔ اور اس طرح اس دفعہ بھی آپ گرفتاری سے بال بال بچ گئے۔ اور بخیر و عافیت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ (59)

تحریک کے اہم مراکز:

قبل اس کے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی خدمات اور حجاز میں حضرت شیخ الہندؒ کی سرگرمیوں کو ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کے چند اہم مراکز پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے۔ تاکہ تحریک کی ہمہ گیری اور مستحکم بنیادوں پر تنظیم کے ڈھانچے کا پتہ چل سکے۔ تحریک کے مندرجہ ذیل اہم ترین مراکز یہ تھے:

1۔ دیوبند	2۔ دہلی	3۔ گوٹھ پیر جھنڈا	4۔ دین پور
5۔ امروٹ	6۔ کراچی	7۔ چکوال	8۔ ترنگ زئی
9۔ یاغستان	10۔ کابل	11۔ رائے پور	12۔ پانی پت
13۔ راجستھان	14۔ مدینہ منورہ		

www.rahnia.org

دیوبند:

دیوبند کے مرکز کو حضرت شیخ الہندؒ کے حجازِ مقدس روانہ ہونے سے قبل تک اس عظیم ترین انقلابی تحریک کے ہیڈکوارٹر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا، جو کوٹھی کے نام سے مشہور ہے، جس میں ملک وبیرون ملک سے آئے ہوئے انقلابی لیڈراور تحریک کے خفیہ کارکن جن میں ہندو بھی ہوتے تھے۔ اور مسلمان بھی آکر ٹھہرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ رات کے اندھیروں میں ان لوگوں سے ملاقات کرتے اور ہدایات دیتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اکثر بڑے بڑے لیڈروں کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے ان کو دیوبند طلب فرماتے تھے۔ (60)

چناں چہ تحریک کے ایک رضا کار اور جاں باز سپاہی خان عبدالغفار خانؒ عرف باچہ خاں کے بارے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

> ''خان بادشاہ عبدالغفار خانؒ اتمان زئی ضلع پشاور کے مشہور ومعروف قومی خادم اور کارکن ہیں۔ ابتدا میں ان کا تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے پیدا ہوا۔ خدمت میں حاضر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ بیعت بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنے سیاسی تعلقات کا بڑے مجمع میں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے ذکر فرمایا کہ: ''میں بارہا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا ہوں۔ ملاقات کا وقت اور جگہ کی اطلاع کسی شخص کے ذریعہ کر دیتا تھا۔ اور دیوبند سے پہلے کے یا بعد کے اسٹیشن پر اتر لیتا تھا۔ اور وہاں دونوں مجتمع ہوکر باتیں کر لیتے تھے۔ پھر اپنے اپنے مقصد کے لیے مناسب گاڑیوں پر روانہ ہو جاتے تھے۔ سی آئی ڈی کو اطلاع نہ ہوتی تھی۔ ٹکٹ آگے کے ہوتے تھے۔ اس طرح بارہا ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحبؒ بہت بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے، جن کے انجام دینے کی کاروائیاں اس قدر اخفا کی محتاج ہوتی تھیں۔'' (61)

مشہور ہے کہ دارالعلوم کے احاطے میں شمالی جانب ایک تہہ خانہ ہے، جو آج بھی موجود ہے۔ یہ بھی شیخ الہندؒ کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اور یہاں ہتھیار بھی جمع کیے جاتے تھے۔ (62)

دہلی:

اس مرکز کے صدر ڈاکٹر مختاراحمد انصاریؒ تھے، جو حضرت شیخ الہندؒ سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اور نہایت رازداری سے سرگرمی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ (63) جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر دہلی میں ''نظارۃ المعارف'' قائم کیا تو دِلی کی مرکزیت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس شہر کو جو سیاسیاتِ ہند کا بھی مرکزِ عظمیٰ تھا۔ یہ سعادت برابر حاصل رہی، تا آں کہ تحریک کے راز فاش ہونے کے بعد ''نظارۃ المعارف'' کے نائب ناظم حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ گرفتار کر لیے گئے۔

گوٹھ پیر جھنڈا:

یہ مرکز گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا قائم کردہ تھا۔ 1891ء کے اوائل میں حضرت امام سندھیؒ دیوبند سے واپسی پر سندھ کے اس علاقہ میں پہنچتے ہیں۔ آپ نے پہلے ایک مطبع بنایا، جو دوسال تک چلتا رہا۔ اور بعض عربی اور سندھی کی نایاب کتابیں اس مطبع سے شائع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک ماہوار رسالہ ''ھدایۃ الاخوان'' چھپتا رہا۔ بعد ازاں حضرت مولانا راشداللہ صاحب العلم الرابع کی معاونت سے 1901ء میں ''دارالرشاد'' کے نام سے مدرسے کی صورت میں یہ مرکز قائم ہوا۔ سات سال تک علمی وانتظامی کامل اختیارات کے ساتھ حضرت امام سندھیؒ یہاں کام کرتے رہے۔ تا آں کہ 1909ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند طلب فرمایا۔ اور ''جمعیۃ الانصار'' قائم ہوئی، مگر دارالرشاد میں کام جاری رہا۔ ''دارالرشاد'' میں حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا شیخ حسین بن محمد محسن انصاری یمانیؒ امتحان کی غرض سے تشریف لائے۔ یوں اس مرکز کی براہِ راست نگرانی حضرت شیخ الہندؒ کی رہی۔ حضرت امام سندھیؒ کو اس مدرسہ میں حضرت نبی اکرم ﷺ اور امام مالکؒ کی خواب میں زیارت بھی ہوئی تھی۔(۶۴)

دین پور:

یہ مرکز شہر دین پور تحصیل خان پور ضلع رحیم یار خان میں واقع تھا۔ یہ شہر اصل میں قادری راشدی بزرگان کی چلائی ہوئی خفیہ تحریک آزادی کا مرکز تھا، جس کی قیادت اپنے وقت کے مقبول ترین ولی کامل، حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈیؒ کے خلیفہ اوّل حضرت مولانا غلام محمد دین پوریؒ فرما رہے تھے۔ اور بعد میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی انتھک جدوجہد سے یہ مرکز تحریک شیخ الہندؒ کے ساتھ مربوط ہوگیا تھا۔ چناں چہ اس ربط کے قائم ہونے کے بعد دین پور سرحدی علاقوں میں تحریک شیخ الہندؒ کا مرکز قرار پایا۔ (65) اس مرکز کے ذریعے جہاں لوگوں کی ذہن سازی کا کام لیا جاتا تھا، وہیں جہاد کے لیے اسلحہ بارود وغیرہ بھی جمع کیا جاتا تھا۔ اس مرکز کے قائد حضرت دین پوریؒ کی خانقاہ کے صدر دروازے کے نیچے تہہ خانے میں گولہ بارود بنانے کی فیکٹری تھی، جس میں خانقاہ کے خدام تندھی کے ساتھ کام کرتے تھے۔

دین پور اور دیوبند میں قوی رابطہ تھا۔ جو فیصلے شیخ الہندؒ دیوبند میں بیٹھ کر فرماتے تھے، ان پر یہاں عمل ہوتا تھا۔ اور اس جگہ کی باتیں ان تک پہنچتی تھیں۔ آپس کے ربط اور تبادلہ اخبار کے حیرت انگیز نظام کا یہ عالم تھا کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جب دیوبند سے کابل روانہ ہونے سے پہلے دین پور پہنچے تو فوراً حضرت دین پوریؒ نے دریافت کیا: ''ارے تم کابل نہیں گئے؟'' گویا ان کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی آمد سے پہلے ہی پورے پروگرام کا علم ہو چکا تھا۔''(۶۶)

www.ranimia.org

امروٹ:

حضرت دین پوریؒ کے پیر بھائی، سید العارفین، حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈیؒ کے دوسرے خلیفہ، اور تحریک شیخ الہندؒ کے جاں باز خادم حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ نے یہ مرکز قائم کیا تھا۔ یہ مرکز امروٹ ضلع شکارپور میں واقع تھا۔ حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ کے لاکھوں مریدین تھے۔ امروٹ اور آس پاس کے علاقوں میں آزادی کی روح پھونکنے کا کام انجام دیتے تھے۔ جہادِ آزادی کے لیے یہاں بھی زبردست تیاری تھی۔ اس مرکز کا بھی دیوبند کے مرکز سے قریبی تعلق تھا۔ مولانا تاج محمود امروٹیؒ متعدد دفعہ دیوبند بھی آئے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ ان سے ملنے امروٹ بھی تشریف لے گئے۔ (67)

کراچی:

اس مرکز کے نگران حضرت مولانا محمد صادق کراچویؒ تھے، جو انھوں نے کراچی کے ایک علاقہ ''کھڈہ'' میں قائم کیا تھا، جہاں آج مدرسہ مظہرالعلوم موجود ہے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اور مشن آزادی میں ہمیشہ سرگرمی سے شریک رہے۔ نہایت جوشیلے، رازدار، مستقل مزاج شخص تھے۔ تقسیمِ ہند تک دارالعلوم دیوبند کے ممبر شوریٰ اور جمعیت علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ اس مرکز کے اراکین نے 1914ء کی جنگ کے حوالے سے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو اس مرکز کی نگرانی میں بلوچ قبائل کے ذریعے لسبیلہ میں بغاوت کروائی گئی۔ مسٹر ٹاؤنشنڈ، جو عراق پر حملہ کا کمانڈر انچیف تھا۔ اس کو اس راستے سے کمک اور فوجی مدد پہنچتی تھی۔ اس مرکز نے اس کمک کو روک دیا۔ بالآخر کوت العمارہ میں ٹاؤنشنڈ محصور ہوگیا اور انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ اس بغاوت کی وجہ سے عراق میں جو انگریزی فوج محصور ہوئی تھی، ابتداءً اس کی تعداد 30 ہزار تھی۔ اور جب محاذ ٹوٹا تو کل 13 ہزار افراد باقی بچے تھے۔ (68)

گویا یہ بغاوت 17 ہزار انگریزوں کی ہلاکت کا ذریعہ بنی۔ اس بغاوت کے جرم میں حکومتِ ہند نے حضرت مولانا محمد صادقؒ کو گرفتار کرلیا تھا۔

چکوال:

اس مرکز کے منتظم حضرت مولانا ابومحمد احمد چکوالیؒ تھے، جن کو جمعیۃ الانصار کے بانی ممبر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ (69) یاغستان کے آزاد علاقے میں سرمایہ پہنچانے کا کام مولانا ابومحمد احمد چکوالیؒ اور مولانا حمداللہ پانی پتیؒ سرانجام دیتے تھے۔ (70) اس مرکز اور مولانا احمد چکوالیؒ کے بارے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

www.rahnuma.org

''مولانا احمد صاحب مرحوم چکوال کے باشندے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ صاحب کے مخلص دوست اور مشن کے سرگرم ممبر تھے۔ مشن تحریکِ آزادی کی برانچ چکوال، جو کہ پنجاب میں تھی، موصوف اس کے صدر تھے۔ نہایت استقلال اور بے جگری کے ساتھ مشن کے کاروبار میں شریک رہے۔ اور ہزاروں کو ممبر اور ہم خیال بنایا۔ دیوبند میں ان کی آمد ورفت بارہا ہوئی۔ گرفتاریوں کے دور میں ان کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔'' (71)

ترنگ زئی:

یہ مرکز تحصیل چارسدہ (صوبہ سرحد) میں موضع اتمان زئی (خان عبدالغفار خان صاحبؒ جہاں کے رہنے والے ہیں) کے قریب ایک گاؤں میں واقع تھا۔ اس مرکز کے سربراہ حضرت حاجی فضل واحد معروف حاجی ترنگ زئیؒ تھے، جن کا پہلے ذکر ہوا۔ آزاد علاقہ یاغستان کا مرکز قائم ہونے سے پہلے حاجی ترنگ زئیؒ اپنے مریدین کے ساتھ اس جگہ تحریک آزادی کا علم بلند کیے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں تحریکِ آزادی پہلے سے جاری تھی۔ جسے حاجی ترنگ زئی صاحبؒ نے قائم ودائم رکھا۔ حاجی ترنگ زئیؒ، حضرت مولانا شاہ نجم الدین صاحب مرحوم، معروف ہڈئے ملاؒ کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ حضرت مولانا نجم الدین صاحب ہڈئے ملاؒ، حضرت مولانا اخوند شاہ عبدالغفور سواتیؒ عرف سیدو بابا کے خلیفہ و جانشین تھے۔ آخر الذکر یہ دونوں بزرگ صوبہ سرحد کے اطراف میں بہت زیادہ بااثر غیور مجاہد گزرے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے اپنے زمانے میں انگریزی اقتدار کے خلاف سالہا سال علَمِ حریت بلند کئے رکھا تھا۔ اور انگریزی اقتدار کو حد سے زیادہ نقصان پہنچاتے رہے تھے۔ حاجی ترنگ زئی صاحبؒ بھی اپنے پیرانِ طریقت کے قدم بہ قدم تھے۔ جذباتِ حریت وآزادی اور جدوجہدِ آزادی کے حد سے زیادہ دل دادہ تھے۔ انہی مبارک جذبات کے تحت اس مرکز میں آزادی کی شمع جلاتے رہے۔ (72)

یاغستان:

یہ مرکزِ حریت 1914ء کی جنگِ عظیم اول کے دوران قائم کیا گیا۔ اس کے سربراہ بھی حاجی ترنگ زئیؒ تھے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ الہندؒ نے بار بار مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا عزیر گل صاحبؒ کو حاجی ترنگ زئیؒ کی خدمت میں بھیج کر اپنے مشن میں داخل کیا۔ اور استدعا کی کہ وہ اپنے وطن سے آزاد علاقے یاغستان میں ہجرت کر کے چلے جائیں۔ اور وہاں مرکز کو سنبھالیں۔ اور اپنے بے شمار شاگردوں، جو اپنے اپنے علاقوں میں درس وتدریس میں مشغول تھے، کو لکھا کہ وہ حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کی تابعداری کریں۔ ..... چناں چہ 1914ء میں اعلانِ جنگِ عمومی کے بعد حاجی ترنگ زئی صاحبؒ وہاں پہنچے اور تحریکِ آزادی

www.rahimia.org

کے جھنڈے کو بلند کیا۔ اور پلٹنیں کی پلٹنیں صاف کر دیں۔''

اس میدانِ جنگ کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ انگریزی فوجوں کو بہت مشکلات کا سامنا تھا۔ جب کہ آزادی پسندوں کو ایسی مشکلات درپیش نہ تھیں۔ وہ ان علاقوں سے آشنا اور علاقائی ضرورت کے مطابق اقدامی اور دفاعی اقدامات بسہولت کر لیتے تھے، لیکن انھیں رسد کی کمی کا سامنا تھا۔ نیز انگریز نے اپنی کام یابی کے لیے مختلف سازشوں کا سہارا لیا، جس کی بنا پر جب تحریکِ حریت کا سلسلہ بند ہوا تو حضرت حاجی صاحبؒ کو ریاست ''مہمند'' میں مقیم ہونا پڑا۔ اور مولانا سیف الرحمٰن وغیرہ کابل روانہ ہوگئے۔ (73)

کابل:

کابل کو بھی حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پہنچنے کے بعد تحریک کا ایک اہم مرکز سمجھا جانے لگا تھا۔ اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے پہلے ہی وہاں تحریکِ شیخ الہندؒ کے سرگرم کارکن موجود تھے۔ اس کی تائید مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے اس انکشاف سے ہوتی ہے، جس کو فاضل مصنف قاضی عدیل عباسی نے اپنی کتاب تحریکِ خلافت میں ذکر کیا ہے کہ:

''مولانا منظور نعمانیؒ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہا کہ جب وہ کابل پہنچے تو جو کام انھیں کرنا تھا، اس کے بارے میں ایک لفافہ خود امیر حبیب اللہ والیٔ افغانستان نے ان کو دیا۔ (74)

حضرت سندھیؒ جب قندھار پہنچے تو وہاں انہیں چند احباب ایسے ملے جن سے ان کا تعارف حضرت شیخ الہندؒ کی موجودگی میں ہندوستان ہی میں ہو چکا تھا۔ اور ان لوگوں کا افغان حکومت میں اچھا رسوخ تھا۔ چناں چہ مولانا عبداللہ لغاریؒ لکھتے ہیں:

''ان میں سے ایک تو صوفی ملا محمد حسن درانیؒ تھے، جو باکمال اولیا میں سے تھے۔ اور حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیق صاحبؒ کے خاص مصاحب تھے۔ وہ مولانا سندھیؒ کو خوب پہچانتے تھے۔ دوسرے صوفی جان محمدؒ، جو بہت بڑے عالم اور ولی اللہ تھے، مولانا کی ان سے بھی جان پہچان تھی۔ حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار صوفی جان محمد صاحبؒ دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کی ملاقات کے لیے آئے تھے، اس وقت میں ''الانصار'' کا ناظم تھا۔ اور اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ ان کو لے کر میرے دفتر میں آئے۔ اور باتوں باتوں میں فرمایا کہ یہ مولوی عبیداللہ سندھیؒ ہیں۔ یہ میرے سب کاموں اور ارادوں سے مکمل واقف ہیں۔ اور میرے دست وبازو ہیں۔ بس اتنی ملاقات کر کے چلے گئے۔'' (75)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ذمہ داریوں کی تفصیل اور ان کا تعارُف حضرت شیخ الہندؒ

نے ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کروادیا تھا۔ اور غالباً یہی وجہ ہوگی کہ دیوبند کی روانگی سے قبل حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کوئی مفصل پروگرام نہ بتلایا تھا، جس کا تذکرہ حضرت سندھیؒ خود بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس بات کے علاوہ بھی کابل میں تحریک شیخ الہندؒ کے اثرات پائے جانے کو تقویت ملتی ہے۔ چناں چہ حضرت سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''افغانستان کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) قاضی عبدالرزاق صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت گنگوہیؒ کے علمِ حدیث میں شاگرد تھے۔ وہ سردار نصراللہ خاں ''نائب امیر السلطنت'' سے خاص طور پر وابستہ تھے۔ ایک عجیب بات وہاں ہمیں یہ نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق، خاص طور پر ان کے پاس اطلاعات تھیں۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ میرا ہی نام عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔'' (76)

رائے پور:

تحریکِ شیخ الہندؒ کا ایک اہم ترین مرکز خانقاہِ رائے پور ہے۔ خانقاہِ رائے پور گنگا جمنا کے درمیان واقع ''دوآبہ'' جو کہ یوپی کے سرسبز وشاداب ضلع سہارن پور کے شمالی حصہ ''کوہِ شوالک'' کے دامن میں واقع ہے۔ دہلی کے اجڑنے کے بعد خانوادۂ ولی اللّٰہی کے جانشین علمائے ربانیین اور مشائخ عظام نے اپنے فکروعمل کا مرکز جن قصبات کو قرار دیا، ان میں تھانہ بھون، دیوبند، گنگوہ، سہارن پور اور رائے پور کی امتیازی شان ہے۔ اور یہ سب مراکز اسی مردم خیز خطہ ''دوآبہ'' میں واقع ہیں۔ (77)

اس خانقاہ کے بانی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ ہیں، جو حضرت عالی جیؒ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے والد راؤ اشرف علی خانؒ، حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے جانثار خدام میں سے تھے۔

جنگِ آزادی میں بظاہر ناکامی کے بعد، نئی حکمت عملی کے تحت، حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا مکہ معظّمہ میں بیٹھ کر کام کرنا، ضروری سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہنے کے لیے جو سفرِ ہجرت کیا گیا، اس میں جمنا پار کے قصبات گمتھلہ، تگری، لاڈوہ۔ پنجلاسہ اور انبالہ میں خفیہ طور پر قیام کیا گیا۔ اسی سفر کے دوران تین حضرات حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے یکے بعد دیگرے تگری میں جناب چوہدری راؤ اشرف علی خانؒ کے گھر پر بھی قیام فرمایا۔

اس وقت قطبِ عالم حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی عمر مبارک تین چار سال کے قریب تھی۔ سب سے پہلے سیدالطائفہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ تشریف لائے۔ چند روز قیام رہا۔ گاؤں کے بچے جب حضرت

قدس سرہٗ سے ملے تو ان میں حضرت رائے پوریؒ آپ کو بڑے منفرد نظر آئے۔ آپ نے ان پر خصوصی شفقت کا اظہار فرمایا۔ اور گلے لگا کر خصوصی توجہ سے پیار دیا۔ ان کے والد صاحب کو ان کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں۔

قرآن پاک کی تعلیم، آبائی وطن ''تنگری'' میں ہی ہوئی۔ حفظِ قرآن پاک کے بعد آپ کچھ عرصہ کے لیے لدھیانہ تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں وہاں جنگِ آزادی کے عظیم رہنما حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب لدھیانویؒ کا خاندان، علم وفضل میں بڑا مشہور تھا۔ ان کے صاحبزادے اور جانشین حضرت مولانا مفتی محمد لدھیانویؒ (دادا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ) سے آپ نے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ (78)

شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے شیخ میاں عبدالرحیم سہارن پوریؒ، حضرت اخوند عبدالغفورؒ سواتی عرف سیدو بابا کے خلیفہ تھے، جو موجودہ صوبہ سرحد کے اطراف میں تحریکِ آزادی کے حوالے سے انگریز کے خلاف عملی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اوران علاقوں میں حصولِ آزادی کی بابت متعدد کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے۔ آپ ہی کی کوششوں سے علاقہ ''سوات وبنیر'' میں قبائل کی ایک آزاد حکومت قائم ہوئی تھی۔ یوں شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو انگریز کے خلاف ان کی مجاہدانہ سوچ اپنے شیخ کے واسطے سے ملی۔ حضرت سیدو بابا کے شیخ خواجہ محمد شعیب تورڈھیرویؒ تھے۔ وہ، ان کے والد، دادا، یہ سب حضرات انگریز کے خلاف تھے۔ اورانگریز کے خلاف عملی جہاد میں مصروف رہے۔ (79)

اسی طرح آپ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے مجازِ بیعت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے جانشین ہیں۔ گویا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو جذبۂ حریت اپنے دور کے چوٹی کے علمائے ربانیین اورآئمہ انقلاب سے ملا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد مشاورت اور راہنمائی کا مرکز گنگوہ سے ''رائے پور'' منتقل ہوگیا اور میدانِ عمل کا مرکز دیوبند ہی رہا۔ یوں جنگ آزادی 1857ء کے بعد آزادی کے حصول کے لیے جو تحریک منظم کی گئی، اس کا مرکز گنگوہ کے بعد رائے پور رہا۔ اور حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کی سرپرستی میں اس تحریک کے لیے افرادی قوت کا مہیا کرنا اور مالی امداد کی سپلائی کو جاری رکھنے کا کام بڑی جرأت وہمت سے ہوتا رہا۔

چوں کہ تحریکِ ریشمی رومال انگریز کے انتہائی جبروآمریت اوردہشت کے ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اس لیے خفیہ طور پر اسے چلانے کے لیے اس کے اراکین سے اس کے رازوں کی حفاظت کے لیے تاحیات حلف وفاداری لیا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں اس تحریک کی بہت سی تفصیلات ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔

اس کے باوجود سرکاری ریکارڈ اور دیگر ذرائع سے جو کچھ ابھی تک سامنے آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کی منصوبہ بندی اوراس کی خفیہ حکمت عملی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے بعد ان کے خلفا

حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ اگرچہ میدانِ عمل میں سرگرمی کا مرکز حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ گرامی تھی، لیکن ان تمام حضرات کی مشاورت اور رہنمائی کا مرکز ''رائے پور'' تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ ریشمی رومال اور جنگِ آزادی کے امور شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سے مشورے کے بعد طے کرتے تھے۔ چناں چہ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ فرماتے ہیں:

''تحریک ریشمی رومال میں حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ عام طور پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کے مشورے اور شرح صدر پر عمل فرمایا کرتے تھے۔(80)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلے میں جن لوگوں پر اعتماد فرماتے تھے، ان میں شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا نام نمایاں ہے۔ چناں چہ تحریکِ ریشمی رومال کے اہم کردار امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں:

''تحریک آزادی ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ ہی نہیں چلا رہے تھے، بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردوں کی ایک جماعت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگردوں اور مریدین کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ جیسے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ ہیں۔(71)

اس اقتباس سے یہ نتیجہ اَخذ ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے مختلف معاملات اور اہم کاموں میں شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ شریک رہے ہیں۔ چناں چہ تحریکِ آزادی کی ایک اہم کڑی جمعیۃ الانصار کے ایک انتہائی اعلیٰ سطحی اجلاس کے شرکا میں ایک نام حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا بھی آتا ہے۔(82)

ترکی سلطنت پر جب انگریزوں نے جبر و ستم شروع کیا تو اس موقع پر ترکوں کی مدد کی خاطر ہندوستان بھر میں چندہ مہم چلی۔ اس بابت ضلع سہارن پور کے علاقے میں حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی خصوصی کاوشوں کو حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے نمایاں حیثیت سے ذکر کیا ہے۔(83)

حضرت شیخ الہندؒ جب حجاز تشریف لے گئے تو تحریکِ ریشمی رومال کا کام حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے سپرد ہوگیا۔ چناں چہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اپنی آپ بیتی میں فرماتے ہیں:

''شوال ۱۳۳۳ھ/ اگست 1915ء سے پہلے جب حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کا حجاز کا سفر طے ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ایک ہفتہ مستقل مدرسہ مظاہر العلوم میں قیام فرمایا..... اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ اور مولانا الحاج احمدؒ صاحب رام پوری کا قیام بھی اس زمانہ میں سہارن پور ہی رہا۔ یہ چاروں حضرات صبح کی چائے کے بعد مدرسے کے کتب خانے میں تشریف فرما ہوتے تھے۔

کتب خانے کا دروازہ ان کی نشست گاہ سے دور تھا۔ اس کے اندر کی زنجیر لگ جاتی۔ اور ان چاروں حضرات کے علاوہ کوئی شخص اندر نہیں جاسکتا تھا.....

تین چار دن یہی سلسلہ رہا۔ جو لوگ اجمالاً حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے واقف تھے، وہ تو اجمالاً سمجھے ہوئے تھے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے.....

ان ہی ایام میں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کے ذمے حضرت شیخ الہندؒ کی غیبت (عدم موجودگی) میں ان کی تحریک کی سرپرستی تجویز ہوئی تھی۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کا حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حجاز جانا تجویز ہوا تھا، مگر اس طرح کہ علاحدہ علاحدہ سفر ہو۔ اس لیے کہ حکومت کی نگاہ میں دونوں مخدوش تھے۔ خیال یہ ہوا کہ اگر ایک گرفتار ہو جائے تو دوسرا حجاز پہنچ جائے۔'' (74)

ایک مرتبہ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی مجلس میں حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ اور رائے پور کا تذکرہ آیا۔ اس مجلس میں مولانا عبدالمجید سندھیؒ تلمیذ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت رائے پوریؒ کے ذکرِ خیر پر حضرت سندھیؒ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی۔ اور پھر بڑے جوش میں فرمایا:

''عام طور پر لوگ تحریکِ آزادی میں رائے پور کی سیاسی اہمیت کو پوری طرح نہیں جانتے۔ میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں رائے پور نے جو کردار ادا کیا ہے، اس پر مضامین اور کتابیں لکھوں، لیکن کیا کروں کہ حضرت اقدس رائے پوری اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ہمیں اس کے بیان سے منع کیا ہوا تھا۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا رائے پور کے سیاسی کردار سے اچھی طرح آگاہ ہوگی۔'' (75)

شاہ عبدالرحیمؒ اور شیخ الہندؒ:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ یک جان و دو قالب ہو کر مشترکہ جدوجہد میں مصروف رہے ہیں۔ چناں چہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''دونوں حضرات (شیخ الہندؒ اور شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) یک جان و دو قالب ہو گئے۔ اور آخیر تک اسی پر قائم رہے۔ تحریکِ آزادی کی خاطر جب حضرت شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انھیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے۔ اور اپنے کارکنوں کو تاکید کر دی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو میرا قائم مقام سمجھنا۔ اور اہم اُمور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ صاحبؒ انجام دیتے رہیں گے۔ چناں چہ اسی طرح عمل درآمد رہا۔ حضرت رائے پوریؒ نہایت دل سوزی اور استقلال اور

عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امورِ مہمّہ کو انجام دیتے رہے۔ اوران کے خاص خدام بھی دلچسپی لیتے رہے، مگر افسوس کہ ہمارے مالٹا میں اسیر ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی مولانا رائے پوریؒ مریض ہوئے۔ اورعرصہ تک بسترِ مرض پر ناچارگی اورضعف میں مبتلا رہے۔ (86)

آپ کا بسترِ مرگ پر پڑنا دراصل حضرت شیخ الہندؒ کے قید ہونے کے غم کی وجہ سے تھا۔ چناں چہ مولانا عاشق الٰہیؒ صاحب ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''ایک مخلص طبیب نے حضرت عالی رائے پوریؒ کے آخری مرض میں نبض دیکھی اورعرض کیا: حضرت! آپ کو تو بہت پرانی تپ دق معلوم ہوتی ہے۔ اورایسی ہے، جیسے کسی غلبہ حزن وغم میں پیدا ہوتی ہے۔ اوراندر ہی اندر گھلاتی ہے۔ برس ہا برس گزرجانے پر اس وقت آپ کو جوش آیا اور فرمایا: ہاں! حکیم صاحب! سچ فرمایا مجھے تپ اس دن شروع ہوئی، جس دن حضرت گنگوہیؒ نے اس دنیا کو الوداع کہا۔ اور اس کا بدن پر ظہور اس دن ہوا، جس دن خبر سنی کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ مالٹا میں قید ہوگئے۔ آج مولانا رہا ہوکر تشریف لے آویں تو کچھ نہ سہی ایک دفعہ تو جھرجھری لے کر اٹھ ہی کھڑا ہوں گا۔'' (87)

یہ تعلق یک طرفہ نہ تھا، بلکہ دوطرفہ تھا۔ اس لیے یہی حال حضرت شیخ الہندؒ کا تھا۔ چناں چہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے وصال کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ آپ سے اپنے گہرے تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہمدمو! رائے کس سے لوگے؟ کہو! مشورے کس سے اب کرو گے، کہو!
رازِ دل، کس سے اب کہو گے؟ کہو! ''رائے پور'' بھی کبھی چلوگے؟ کہو!
زینت و زیب الف ثانی مرد شاہ عبدالرحیم ثانی مرد (88)

پانی پت:

اس مرکز کے روحِ رواں مولانا احمداللہ پانی پتیؒ تھے۔ یہ پانی پت ضلع کرنال کے باشندے تھے۔ شیخ الہندؒ کے ہم راز، مشن کے مخلص اور جاں بازممبر رہے۔ یہ شیخ الہندؒ کی ڈاک کے جوابات دینے کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے ہیں۔ جب شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو تحریک شیخ الہندؒ کی نگرانی اور رہنمائی کا اہم کام شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے حوالے کرگئے۔ اورکئی اہم انتظامی اورعملی امور کی بجاآوری کے لیے مولانا احمداللہؒ کومقرر کیا۔ چناں چہ ان کے پاس تحریک کے ممبران کا رجسٹر فنڈ دہندگان اور دیگر اہم تحریکی کاغذات ہوتے تھے، جن کو لے کر یہ پانی پت چلے گئے تھے۔ اوروہاں ہی سے یہ تمام کاروائیاں عمل میں لاتے تھے۔ انگریز کی خفیہ محکمے کی رپورٹ میں ان کوتحریک شیخ الہندؒ کا سرگرم رکن قرار دیا گیا ہے۔ مولانا احمداللہؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن میں معین

www.rahimia.org

ومددگار رہے۔ اور سالہا سال اس خدمت کو سرانجام دیتے رہے۔ ان کی ذہانت اور امانت پر شیخ الہندؒ کو بہت زیادہ اعتماد تھا۔ (89) یاغستان میں مالی امداد پہنچانے کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔

راجستھان:

تحریک شیخ الہندؒ کے انقلابی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر اسلحہ خانے بھی قائم تھے۔ اس سلسلے میں دین پور کے مرکز کی سرگرمیوں کا اوپر تذکرہ ہوا۔ یہاں ایک اور واقعہ ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ دلچسپ ہونے کے ساتھ تحریکِ شیخ الہندؒ میں اعلیٰ پائے کی راز داری اور حکمتِ عملی کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔ مولانا منظور نعمانیؒ راوی ہیں، ان سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے فرمایا کہ:

''وہ کراچی میں تھے کہ شیخ الہندؒ کا ایک نامہ ملا، جس میں ان کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ایک شخص فلاں دن فلاں وقت تمہارے پاس آئے گا۔ وہ جو کچھ کہے اسے محفوظ کر لینا۔ اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔''

چناں چہ کراچی کی ایک مسجد میں وہ شخص آیا۔ اور اس نے میگزین، بندوق اور گولہ بارود وغیرہ کی تفصیلات بتائیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اس کو محفوظ کر لیا۔ اور جب دیوبند گئے تو حضرت شیخ الہندؒ کو بتلا دیا۔ ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے بعد میں لوگوں کے ذریعے پتہ چلا کہ شیخ الہندؒ نے میگزین کا کوئی کارخانہ جہاں اسلحہ وغیرہ رکھا جاتا تھا، قائم کیا ہوا تھا، جس کا کوئی پتہ آج تک سی آئی ڈی کو نہ لگ سکا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ کارخانہ راجستھان میں تھا۔ (90)

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی گہری تدابیر اور رازداری سے یہ تحریک چل رہی تھی۔ دُور دُور تک جڑیں رکھنے والی اس تحریک کے چند ریشمی خطوط انگریز کو مل گئے تو وہ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھا۔ اور تحریک شیخ الہندؒ کا نام تحریکِ ریشمی رومال رکھ دیا۔ ورنہ اس تحریک میں ریشمی خطوط درحقیقت بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔

مدینہ منورہ:

پاک وہند کے ان مراکز مشہورہ کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ کے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد اس کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہاں اگرچہ پہلے سے حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد شاگرد، شیخ الاسلام، مولانا حسین احمد مدنیؒ اقامت گزین تھے۔ مگر اس وقت تک ان کو عصری سیاسیات سے براہِ راست دلچسپی نہ تھی۔ حضرت مدنیؒ خود فرماتے ہیں:

''میں حضرت شیخ الہندؒ کی مکہ آمد سے پہلے تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا، نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کاروائیوں سے مطلع فرمایا۔

میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا.....حضرت شیخ الہندؒ کے واقعات اور خیالات سن کر مَیں بھی متاثر ہوا۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ بھی۔ گو کہ عملی حوالے سے حضرت سہارن پوریؒ پہلے سے حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق سفر تھے۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور بسم اللہ کا وقت ہے۔''(91)

مدینہ طیبہ کے مرکز تحریک ہونے کی تائید انڈیا آفس لندن میں انگریز کے پولیٹیکل اینڈ سیکرٹ ڈیپارٹمنٹ کے محفوظ ریکارڈ سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ''الجنود الربّانیہ'' نامی عوامی فوج کا ہیڈکوارٹر مدینہ منورہ کو قرار دیا تھا۔ جنودِ ربانیہ کا مقصد کامل آزادی کے حصول کی خاطر فوجی اصول پر جماعت تیار کرنا تھا۔ اس جماعت کے عہدے فوج کے اصول پر تھے۔ اس جماعت کا ہدف اسلامی ممالک کے سربراہان سے رابطہ اور ان کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔(92)

انگریز کے خفیہ محکموں کو اس تحریک کے تمام ارکان کے ناموں تک رسائی نہیں ہوسکی، بلکہ اس کو اس تحریک کے بانی کا بھی علم نہ ہوسکا۔ چناں چہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی بجائے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو اس کا محرک قرار دیتا رہا۔ اس کی لاعلمی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کو تحریک کے صرف تین میجر، دو کیپٹن اور ایک لیفٹیننٹ کے نام کا پتہ چل سکا۔

تحریک کی وسعت اور قربانی کا جذبہ:

تحریکِ شیخ الہندؒ کی وسعت اور ہمہ گیری سے متعلق چند اور باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چناں چہ جناب عبداللطیف کرتپوریؒ، جو عرصہ دراز تک حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں رہے تھے، کہتے ہیں کہ:

''حضرت شیخ الہندؒ نے ایک جماعت ''مخلصین'' کے نام سے بنائی تھی، جس کے بہت ہی چُنے ہوئے ارکان تھے، وہ کسی کو سفارشی خط لکھیں تو سب کچھ لکھ دیں گے، مگر ''مخلصین'' کا لفظ نہیں لکھیں گے۔ یہ لفظ صرف جماعت کے نہایت اہم ارکان کے لیے مخصوص تھا۔ اگر وہ کسی کو لکھ دیں کہ یہ بہت مخلص ہیں۔ ان کو دس ہزار روپیہ دے دو تو وہ اپنا مکان، سارا اثاثہ وغیرہ، غرض کہ ہر چیز بیچ کر دس ہزار روپیہ ادا کردے گا۔''(93)

بیرونِ ہند تحریک کے اثرات:

جناب عبداللطیف کرتپوریؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے شیخ الاسلام، ترکی کے مفتی اعظم، شیخ مصر الازہر اور علما و مفتیانِ مصر حضرت شیخ الہندؒ کے ہم نوا تھے۔(94)

حضرت شیخ الہندؒ کی قائم کردہ جماعت ''مخلصین'' کے افراد ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ہند میں بھی اپنی

سرگرمیوں میں مشغول تھے، جہاں اور جتنا ممکن ہوتا، انگریزوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ لائق مطالعہ ہے:

جس زمانے میں شاہِ ایران نے اپنے ملک میں تمباکو کی واحد ٹھیکے داری انگریز کو دے دی تو وہاں کے مجتہد العصر قابو میں نہ آتے تھے۔ چناں چہ جماعت مخلصین نے مزدور بن کر جہاز سے سامان اُتارنے کا کام شروع کیا۔ اور انگریز نگران جب شراب پی کر بدمست ہوگئے تو ایک صندوق لے جا کر مجتہد العصر کو دکھلایا۔ اس میں تمباکو کی بجائے آلاتِ حرب بند تھے۔ تب مجتہد العصر نے فتویٰ دیا کہ: ''تمباکو نوشیدن دریں زمانہ حرام است'' کہ اس زمانے میں تمباکو استعمال کرنا حرام ہے۔ رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں گیا تو خلافِ معمول اسے حقہ تیار نہیں ملا۔ آواز دی تو کوئی نہ بولا۔ بادشاہ کو غصہ آیا اور وہ زور سے چلائے ''من آوازی دھم وکس نمی شنید ایں چہ ماجرا است'' کہ میں نے آواز دی۔ اور کسی نے نہ سنی۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ تو بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ اور کہا: ''آج آپ کو حقہ نہیں ملے گا'' اور مجتہد العصر کا فتویٰ دکھلایا تو بادشاہ نے فوراً دربار کیا۔ اور مجتہد العصر کو بلا کر کہا کہ: ''حضرت یہ فتویٰ کیسا ہے؟ اسلام تو ایک عالم گیر مذہب ہے۔ اور قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ کیا کہ تمباکو پینا اس زمانے میں حرام اور دوسرے میں حلال۔ ایران میں حرام اور ترکستان میں حلال؟'' تو مجتہد العصر نے بادشاہ سے تنہائی کی درخواست کی۔ اور پورا واقعہ بتلایا۔ اس طرح سے ایران میں انگریزوں کی تمباکو پر اجارہ داری ختم ہوگئی۔ (95)

مولانا سلمان منصور پوریؒ ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تحریک کے متعلق مذکورہ بالا انکشافات اگرچہ عام مؤرخین ذکر نہیں کرتے، لیکن تحریکِ شیخ الہندؒ جیسی عظیم انقلابی تحریک کو دیکھتے ہوئے، یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس طرح کے نہ جانے کتنے مراکز اور نامعلوم کتنے واقعات ہوں گے، جو انہی متعلقہ افراد کے ساتھ اس دنیا سے پردہ کر چکے ہیں۔ بہر حال تاریخ کے ان دھندلے نقشوں سے تحریک کے بارے میں جو عظیم تصور قائم ہوتا ہے۔ اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مراکز میں رابطے کا ایک خفیہ اور زبردست نظام تھا، جو ہمیشہ متحرک رہتا تھا۔ (96)

علمائے حق کی اس جدوجہد کی اہمیت اور اثرات اتنے ہیں کہ بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ایران کے اندر سامراج دشمن شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والی انقلابی جماعت بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے۔ چناں چہ امریکہ دشمن ایران کے موجودہ مذہبی پیشوا علی خامنہ ای نے بحیثیت صدر ایران ''اسلامی حکومت'' کے عنوان سے ہونے والی تیسری کانفرنس منعقدہ جمادی الاول ۱۴۰۵ھ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: ''انیسویں صدی کے آغاز میں اکابر علمائے ہند، جیسے شاہ عبدالعزیزؒ اور سید احمد شہیدؒ ہی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اس خطے میں سب سے پہلے آزادی کی شمع جلائی۔ مگر انگریز کے ایجنٹ ہندی عوام کے سامنے ان کی کردار کشی کرتے ہیں۔'' علی خامنہ ای مزید کہتے ہیں: ''انگریز

نے ہندوستان میں اسلام کے حقیقی مبلغ دارالعلوم دیوبند کے مقابلے پر مغربی رجحانات والا اسلامی مدرسہ (علی گڑھ) قائم کیا۔(97)

اتحاد تنظیمات مدارسِ دینیہ کا ایک وفد دسمبر 2005ء میں ایران کے دورہ پر گیا۔ جس میں پاکستان کے وہ معروف علما بھی شامل تھے، جو ماضی میں شیعہ سنی مسئلے میں پیش پیش رہے۔ وفد میں شامل ایک صاحب نے دورۂ ایران کی رپورٹ میں لکھا: جناب خامنہ ای صاحب سے کسی نے پوچھا کہ:

آپ حضرات نے اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا کیا ہے؟ اس پر ان کا جواب تھا: علمائے ہند کی برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کے کارناموں سے۔''(98)

مراکز کے باہمی رابطوں کی خفیہ صورتیں:

تحریک کے مراکز کے مابین رابطوں کے لیے کیا کیا صورتیں اختیار کی گئیں؟ ان میں کچھ کا تذکرہ محفوظ رہ گیا۔ مثلاً ایک شخص پشاور سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس حاضر ہوا۔ وہ کاغذ کا پھول اور گل دان بنانا جانتا تھا۔ حضرت اسے کابل کے لیے خط دیتے، وہ اسے پھول کی شکل میں بدلتا۔ اور دیگر پھولوں کے ہمراہ گل دان کی صورت میں پشاور لے جاتا، کسی کو گمان تک بھی نہ ہوتا کہ کسی پھول میں خط بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح وہ شخص باقی پھول تو مقامی طور پر فروخت کر دیتا، لیکن اصل پھول کسی کابل والے کے ہاتھ تھما دیتا، جو اس غرض سے پشاور میں موجود ہوتا تھا۔(99)

اس واقعے کے ضمن میں سلمان منصور پوریؒ لکھتے ہیں:

''مذکورہ واقعے کی تائید حضرت مولانا اسعد مدنیؒ نے بھی اپنا ایک مقالہ پڑھنے کے دوران فرمائی۔ اور بتایا کہ انھوں نے بذاتِ خود گل دان بنانے والے معمر شخص سے ملاقات کی ہے۔ اس طرح کے واقعے کا ثبوت اگرچہ تاریخ جنگِ آزادی کی عام کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن تحریکِ شیخ الہندؒ جیسی تحریکات کے لیے بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔''(100)

تحریک کے مراکز میں تعلق کے سلسلے میں ایک اور واقعہ حضرت مولانا عبدالہادی دین پوریؒ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ صبح کی نماز کے بعد حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کے پاس سرخ وسفید رنگ کا ایک نوجوان مسجد میں آیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی بھوری کٹری داڑھی تھی۔ اور سر پر کلاہِ مشہدی باندھے ہوئے تھا۔ بظاہر افغانی معلوم ہوتا تھا۔ اور باادب ہوکر حضرت دین پوریؒ سے مصافحہ کیا۔ حضرت دین پوریؒ فوراً کھڑے ہوگئے۔(101) اور اس شخص کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جماعت کے دیگر احباب چوں کہ حضرت کے مزاج شناس تھے، اس لیے کوئی دوست اس طرف نہیں گیا، لیکن چوں کہ میں (راوی) بچہ تھا، اس لیے

قریب جا کر دلچسپی سے یہ کاروائی دیکھتا رہا۔ اس نو وارد نے اپنی مشہدی اتار دی۔ اور زریں کلاہ کو اُدھیڑ ڈالا۔ اس میں سے زرد رنگ کا ایک ریشمی رومال برآمد ہوا، جسے اس نے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔'' (102)

حضرت شیخ الہندؒ کے پیغامات کو تحریک کے دوسرے مراکز تک پہنچانے میں حضرت مولانا عزیر گلؒ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز سے روانہ ہونے سے قبل آپ کو حاجی ترنگ زئیؒ کے پاس بھیجا تھا۔ اور ان کی واپسی تک سفر کو موقوف رکھا تھا۔ اس کے علاوہ خان عبدالغفار خانؒ کا بھی بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ حاجی ترنگ زئیؒ سے خط و کتابت کا کام خان عبدالغفار خانؒ کی وساطت سے انجام دیتے تھے۔ (103)

مولانا عزیر گلؒ رازداری قائم رکھنے میں بہت پختہ کار تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے کچھ عرصہ قبل حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ کے رفقا نے مولانا عزیر گلؒ سے ملاقات کے دوران تحریک کے بعض رازوں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کوئی راز بیان نہ کیا بلکہ ایسا تأثر دیا جیسے وہ ایسی کسی تحریک سے آشنا ہی نہیں ہیں۔

یہ تھی تحریک کے مراکز اور اس کے درمیان رابطہ اور رازداری کی ہلکی سی جھلک۔ اب تحریک شیخ الہندؒ کی دیگر تفصیلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کابل میں:

پہلے ذکر آچکا ہے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ چناں چہ آپ نے وہاں پہنچ کر تحریک کے لیے انتھک جدوجہد شروع کر دی۔ اگرچہ قدم قدم پر مصائب رُکاوٹ بنتے تھے۔ اپنوں اور غیروں نے دھوکا دیا، لیکن آپ صبر کے پتلے بنے رہے۔ اور کبھی بھی مایوسی کو پاس نہ آنے دیا۔ انھوں نے ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت قائم کی، جسے افغانستان کی حکومت نے تسلیم کر کے اس سے معاہدہ کر لیا۔ دوسرے ملکوں میں بھی اس کی سفارتیں بھیجنے کا انتظام کیا گیا، تاکہ وہ بھی اسے تسلیم کر کے اس کی اَخلاقی مدد کریں۔ کابل میں رہ کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے وطن کی آزادی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں، جس نے ہندوستان کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ افغانستان میں آپ کی اہم خدمات کو ''نقش حیات'' میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ یوں بیان کرتے ہیں:

ا۔ آپ نے ترک جرمن مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کی صحیح پوزیشن سمجھائی۔ اور اپنی بات کو منوایا۔

ب۔ عارضی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کو صحیح راستہ بتلایا۔ ان کو متفق کیا۔ اور غلط راہ سے ہٹنے پر مجبور کیا۔

ج۔ آپ نے اپنا قومی اثر اراکین دولت افغانیہ میں پیدا کیا۔ اگرچہ امیر افغانستان سردار حبیب اللہ کو جنگ

آزادی پر عملی طور پر آمادہ نہ کر سکے۔ اور انگریز کی ڈپلومیسی سد راہ بنی تاہم امیر صاحب مرحوم نے آپ سے بہت تاثر حاصل کیا اور آپ کو مفید مشورے دیے، جن میں ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت بھی ہے۔

د۔ آپ نے عمومی طور پر اراکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنایا، جس کا کھلا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ روسی مشن کی واپسی کے بعد جب امیر صاحب نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبرانِ جرگہ ان کے ہم خیال و ہم زبان تھے۔ انھوں نے آئندہ حکمران بننے والے امیر امان اللہ خان کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اقتدار پا جانے کے بعد بالکل آپ کا ہم خیال ہو گیا۔ اور انھوں نے دولتِ افغانیہ کے استقلالِ کامل کا اعلان کر دیا۔ اور جب افغان برطانیہ جنگ مئی 1919ء ہوئی تو آپ نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا۔ اور اپنی جماعت کے تربیت یافتہ افراد کو بھی جنگ کا حکم دیا۔ تا آں کہ برطانیہ کو شکست ہوئی اور اس پر کابل میں برطانیہ کے متعین سفیر ہمفرے نے کہا تھا کہ: ''یہ فتح دولتِ افغانیہ کی نہیں بلکہ عبیداللہ سندھی کی فتح ہے۔'' (104) کابل میں رہ کر آپ کا ایک انتہائی اہم کارنامہ ''الجنود الربانیہ'' نامی عوامی فوج کی تشکیل تھا، جس کے سپہ سالار حضرت شیخ الہندؒ متعین کیے گئے تھے۔ اور بہت سے تحریک کے ممبروں کو ان کی سرگرمیوں کے مطابق جنرل، میجر، لیفٹیننٹ کرنل وغیرہ کے عہدے دیے گئے تھے۔ اس جماعت کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منورہ کو قرار دیا گیا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں سرگرمیاں:

پہلے گزر چکا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو حضرت شیخ الہندؒ کابل بھیج کر خود حجاز تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز پہنچتے ہی مکہ معظمہ کے گورنر غالب پاشاؒ سے ملاقات کی، جو پہلے ہی آپ سے شناسا تھے۔ آپ نے انھیں ہندوستان کی صحیح صورتحال اور اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ غالب پاشاؒ نے ہر طرح کی آپ کی امداد اور آپ سے تعاون کا یقین دلایا۔ اور اس سلسلے میں آپ کو کئی تحریریں دیں۔ ایک تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی، جس میں انھیں ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ اور کہا گیا تھا کہ اہل ہند کو آزادیٔ کامل پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔ اور اپنی جدوجہد کو تیز کر دینا چاہیے۔ یہی وہ مشہور تحریر ہے جو تاریخ میں ''غالب نامہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ ایک دوسری تحریر گورنر مدینہ بصری پاشاؒ کے نام تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مولانا محمود حسنؒ کو استنبول تک بحفاظت پہنچانے اور انور پاشاؒ اور جمال پاشاؒ سے ان کی ملاقات کا بندوبست کرا دیا جائے۔ تیسری تحریر غازی انور پاشاؒ وزیر جنگ ترکیہ کے نام تھی۔ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے نام کے بعد ان کے منصوبے میں امداد دینے کی سفارش کی گئی تھی۔

حضرت شیخ الہندؒ یہ تحریریں لے کر مدینہ منورہ تشریف لائے۔ حسن اتفاق سے غازی انور پاشاؒ اور جمال پاشاؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس طرح ان دونوں ترکی زعما سے آپ کی ملاقات مدینہ منورہ ہی میں ہو گئی۔ جمال پاشاؒ آپ

کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ اور ملاقات کے بعد آپ کی استعمار دشمنی کو یوں خراج تحسین پیش کیا: ''اگر محمود حسن کو جلا کر راکھ بھی کر دیا جائے تو اس کی راکھ بھی انگریز سے کترا کر گزرے گی۔'' (120) انور پاشاؒ بھی آپ کی شہرت سن چکے تھے۔ جب آپ نے انھیں اپنا منصوبہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ امداد کا وعدہ فرمایا۔ اور چند تحریریں لکھ کر دیں۔ جن میں آزاد قبائل کو مجاہدین کا ساتھ دینے اور انگریزوں کے خلاف اپنی کارروائیوں کو تیز تر کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اور آزاد قبائل کو امداد کا اطمینان دلایا گیا تھا۔

اس کے بعد اہم مسئلہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ یا غستان کس طرح پہنچیں۔ ایران کا راستہ، وہاں انگریز فوجوں کے پہنچ جانے کی وجہ سے بالکل بند ہو گیا تھا۔ بحری راستے سے بلوچستان پہنچ کر آزاد قبائل تک پہنچا جائے، لیکن ترک زعما اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کرنے سے معذور تھے۔ ان حالات کے پیش نظر آپ نے ''غالب نامہ'' کو ہندوستان پہنچانے کا ایک محتاط طریقہ سوچا۔ اس کے لیے مولانا ہادی حسنؒ اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کو یہ خدمت سپرد کی کہ مولانا ہادی حسنؒ ان تحریرات کو ہندوستان تک اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ سرحد اور آزاد قبائل میں یہ تحریریں مکمل احتیاط کے ساتھ پہنچا دیں۔

''غالب نامہ'' آزاد قبائل میں:

ہندوستان کے راستے سے مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعے سرحد اور آزاد قبائل میں غالب پاشاؒ کا پیغام پہنچا، جس سے مجاہدین کے جوش میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اور انھوں نے انگریزی غلامی کے طوق کو اُتار پھینکنے کا قصد کر لیا۔ جناب خان غازی کابلیؒ کی تحقیق کے مطابق مولانا منصور انصاریؒ جن تحریروں کو لے کر کابل پہنچے تھے، ان میں ایک تحریر حکومتِ موقتہ اور جنودِ ربانیہ کے نام حضرت شیخ الہندؒ کی تھی، جس میں انھیں حکم دیا گیا تھا کہ 19 فروری 1917ء کی تاریخ میں مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کریں۔ یہ حکم ایک زعفرانی رنگ کے ریشمی رومال میں تھا۔

1۔ قلات اور مکران کے قبائل ترکی فوجوں کی قیادت میں کراچی پر حملہ آور ہوں۔
2۔ غزنی اور قندھار کے قبائل ترک فوج کی مدد سے کوئٹہ پر یلغار کر دیں۔
3۔ پشاور کے محاذ پر درۂ خیبر کے مہمند اور آفریدی، شینواری قبائل حملہ آور ہوں۔
4۔ اُوگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل کی امداد سے حملہ کیا جائے۔
5۔ اس تاریخ کو ہندوستان میں آزادی کا پرچم لہرایا جائے۔ (105)

اگر خان غازی کابلیؒ کی تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی تحریک میں کہاں تک مراحل طے کر چکے تھے۔ اور کامیابی کی منزل ان سے بہت کم فاصلے پر رہ چکی تھی۔ جب ہی تو مولانا محمد علی جوہرؒ اپنی مجلسوں میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: ''حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان

وخیالات بھی وہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ اور جب حضرتؒ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لیے دیوبند تشریف لائے اور رو رو کر کہنے لگے کہ: ''حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی۔'' (106)

امریکہ کا آزادی کش کردار اور شریفِ مکہ کی غداری:

حضرت شیخ الہندؒ غالب نامہ اور دیگر خطوط مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے حوالے کر کے مدینہ منورہ سے دوبارہ مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ خیال تھا کہ غالب پاشاؒ سے ملاقات کے بعد منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ غالب پاشاؒ اس وقت طائف میں تھے۔ آپ طائف تشریف لے گئے۔ اسی دوران ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوگئی۔ ورنہ یہ تحریرات بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوتیں۔ اور حکومتِ ترکیہ اور اس کے حلیف امدا دکرتے۔ ہوا یوں کہ جرمنی اور ترکی کی فتح مندی اور کام یابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف ہوگیا۔ اور مسٹر ولسن کے پُرفریب نکات سامنے آئے تو یکا یک حالت بدل گئی۔ اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب انگریزوں اور فرانس وغیرہ کی مدد پر آگئے۔ اور اسی کے ساتھ جون 1916ء میں شریف حسین نے غداری اور خیانت کر کے انگریز کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلا دی۔ تا آں کہ شام، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کی قتل وغارت گری کرتے تھے۔ اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے۔ اور جدوجہد سے جان چرانے لگے۔ (107)

تحریک کے راز کا افشا:

ان عوامل کے ساتھ ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس عظیم تحریک کا راز افشا ہوگیا، جو دارالعلوم کی سرزمین سے انجمن ثمرۃ التربیت کی شکل میں اٹھ کر پورے نصف عالم کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ جس کے قدم کامرانی کی منزل کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ضروری خیال کیا کہ تحریک کے سلسلے میں کابل میں ہونے والے کام کی تفصیل امیر تحریک حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنی چاہیے تا کہ مفید مشورے لیے جاسکیں۔ اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں۔ چناں چہ اس مقصد کے پیش نظر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ایک خط حضرت شیخ الہندؒ کے نام ایک ریشمی رومال پر تحریر کیا، جس میں جنودِ ربانیہ اور حکومت مؤقتہ کے احوال اور ''غالب نامہ'' کی فوٹو کاپیوں کی آزاد قبائل میں تقسیم کرنے کی اطلاع تفصیل کے ساتھ مذکور تھی۔ یہ خط ۹/ رمضان ۱۳۳۴ھ یوم بمطابق 10 جولائی بروز سوموار 1916ء کا ہے۔ ساتھ ہی ایک خط، سندھ کے شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کو لکھا۔ جس میں مذکورہ خط کو مدینہ منورہ پہنچانے کی ہدایت درج تھی۔ ایک تیسرا خط مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کا لکھا ہوا ہے، جو ۸/ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ کا ہے۔ یہ تینوں خطوط جو ریشمی رومال پر لکھے گئے تھے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے 10 جولائی

1916ء (108) میں عبدالحق کے حوالے کیے کہ وہ ان خطوط کو مولانا عبدالرحیم سندھیؒ کے پاس پہنچادیں۔ تاکہ وہ اسے خود یا کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعے آپ کو حجاز میں پہنچادیں، لیکن وہ خطوط شیخ عبدالرحیمؒ تک پہنچنے کی بجائے ایک ایسے شخص کے ہاتھ لگ گئے، جس نے وہ خطوط انگریز گورنر کی خدمت میں پیش کردیے اور ملک کی آزادی پر انگریز کی خوشنودی کو ترجیح دی۔ بعد ازاں ان خطوط پر سی آئی ڈی مطلع ہوئی تو اس عجیب وغریب انکشاف سے قصر بکھنگم تک ہل گیا۔ پوری حکومتِ برطانیہ کے قلم رو میں زلزلہ آ گیا۔ حکام ششدر رہ گئے۔ اور برٹش انٹیلی جینس کے کارندے اپنی ناکامی پر حیران رہ گئے۔

ایک غلط تأثر اور حقیقتِ حال:

اس واقعے سے یہ تأثر لینا درست نہیں کہ تحریک شیخ الہندؒ کے اندر اہم امور میں راز داری کا خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ اور ذمہ دار مخلص لوگوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے عام لوگوں کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ محض ذاتی مفاد کی خاطر عبدالحق (قاصد) نے حضرت سندھیؒ کے یہ اہم خطوط ملتان کے آنریری مجسٹریٹ خان بہادر رب نواز خان کے حوالے کردیے، جس سے راز فاش ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تأثر غلط اور بے بنیاد ہے۔ جس طرح چندریشمی خطوط کے پکڑے جانے پر ''تحریک شیخ الہندؒ'' کو ''ریشمی خطوط تحریک'' کا نام دے دیا گیا۔ اور اس کا بانی حضرت سندھیؒ کو قرار دیدیا گیا کہ یہ محض ایک شخص کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ حال آں کہ اصل صورتِ حال ایسی نہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت سندھیؒ جیسا زیرک اور محتاط انسان کسی خودغرض اور کمزور آدمی کو اس طرح کی دستاویزات دے دیتا۔ یہ بات کہ اس تحریک کا افشا صرف انہی خطوط کے پکڑے جانے سے ہوا ہے، محلِ نظر ہے۔ اور تھوڑے سے غور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ وہ یوں کہ حضرت شیخ الہندؒ 30 ستمبر 1915ء کو مکہ معظّمہ پہنچ گئے تھے۔ اور جاتے ہی غالب پاشاؒ سے ملاقات کے بعد خطوط حاصل کرکے مولانا ہادی حسنؒ کے ذریعے ہندوستان اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعے آزاد قبائل میں پہنچادیتے ہیں۔ اور یہ خطوط چھپ جاتے ہیں، جس کا انگریز کو علم ہوگیا۔ جب کہ حضرت سندھیؒ 10 جولائی 1916ء کو یہ خطوط عبدالحق کے حوالے کرتے ہیں، جو خان بہادر کے ہاتھ 15 اگست 1916ء کو لگتے ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان میں ''غالب نامہ'' کے چھپ جانے کے بعد انگریز کو آپ کی سرگرمیوں کا علم ہوگیا تھا۔ اور وہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے سرگرم ہوگئے تھے۔ تاآں کہ یہ واقعہ بھی پیش آ گیا۔ گویا افشائے راز کا یہ واقعہ بعد کا ہے۔ (109)

اس تأثر کے غلط ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ عبدالحق، خان بہادر کے دو بیٹوں اللہ نواز خان اور شاہ نواز خان کا اتالیق (ٹیوٹر) رہا تھا۔ خان بہادر کے یہ دونوں بیٹے تحریکِ آزادی میں شامل ہوگئے تھے۔ اور عبدالحق کے ساتھ کابل چلے گئے تھے۔ خان بہادر کے بیٹوں نے ایک خط اپنے والد کے نام لکھا اسے پہنچانے کے لیے عبدالحق ملتان

گیا، مگر خان بہادر کے ہتھے چڑھ گیا۔ اور اس نے تشدد کر کے یہ خطوط ہتھیا لیے، کیوں کہ ایک روایت یہ ہے کہ عبدالحق کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا تھا۔ اور کئی انسانیت سوز اذیتیں دی گئیں۔ آزادی پسندوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ رویہ معمول تھا۔ ورنہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ محض خان بہادر کی ملاقات کے شوق میں عبدالحق ملتان گیا۔ جب کہ اسے معلوم تھا کہ بیٹوں کی وجہ سے خان بہادر اس پر نالاں ہے۔ پھر یہ کہ اگر عبدالحق نے یہ خطوط غداری کرتے ہوئے انگریز کو پیش کرنے ہی تھے تو وہ خان بہادر کو کیوں دیتا۔ سرحد میں داخل ہوتے ہی کسی بڑے انگریز افسر کو دے کر انعام اور تعریفی سند پاتا۔ اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ عبدالحق نے لالچ میں ایسا کیا بلکہ ناقابل برداشت جبر وتشدد کے ذریعے یا کسی دھوکے سے یہ خطوط حاصل کیے گئے۔ آخر الذکر امکان کو سید محبوب رضویؒ نے بھی تاریخ دارالعلوم دیوبند میں لکھا ہے۔ (110) اسی طرح انڈیا آفس لائبریری میں موجود خفیہ رپورٹ سے بھی اسی پہلو کو تقویت ملتی ہے۔(111)

شیخ الہندؒ کی اپنے رفقا سمیت گرفتاری:

غالب نامے کی اشاعت اور خطوط کے پکڑے جانے کے بعد ہندوستان بھر میں گرفتاریوں، قید وبند اور تحقیق وتفتیش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ جہاں جہاں تحریک کا اثر ہونے کا شبہ تھا۔ چھاپے مارے گئے اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا۔

غالب نامے کی اشاعت سے برٹش حکومت بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد انور پاشاؒ کی تحریر برٹش حکومت کے علم میں آئی۔ اور اسے پکڑ لینے کی انتہائی کوشش کے باوجود اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو حکومت حواس باختہ ہوگئی۔ اور اس نے طے کرلیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو بہرصورت گرفتار کرلینا چاہیے۔ اس کے بغیر حالات پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ چناں چہ شریف حسین کو حکم بھیجا کہ وہ آپ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کردے۔ ۲۰ر رجب ۱۳۳۴ھ/ 23 مئی 1916ء بروز منگل سے لے کر ۶ر شوال ۱۳۳۴ھ/ 06 اگست 1916ء بروز اتوار تک طائف سے نکلنا ناممکن ہوگیا۔ کافی مشقتوں کے بعد ۱۰ر شوال بروز جمعرات کو حضرت شیخ الہندؒ مکہ معظمہ تشریف لائے۔ یہاں خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی نے انگریزوں کے ایما پر ترکوں کی تکفیر اور شریف حسین کی بغاوت کے جواز میں ایک فتویٰ تیار کر رکھا تھا، جس پر بہت سے علمائے سو نے دستخط بھی ثبت کردیے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے یہ فتویٰ پیش ہوا تو آپ نے اس کی تصدیق سے انکار کردیا۔ اس بات نے شریف اور اس کے حمایتیوں کو سخت مشتعل کردیا۔ اور اسے آپ کے خلاف کاروائی کرنے کا بہانہ مل گیا۔(112)

اکتوبر 1916ء میں حج سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ایسی تدبیر کررہے تھے کہ بلوچستان کی کسی بندرگاہ پر بادبانی جہاز سے پہنچیں۔ اور وہاں سے یاغستان روانہ ہوجائیں مگر حالات ایسے بنے کہ آپ طائف سے بروقت نہ

نکل سکے۔ شریف حسین نے اُخروی فلاح پر بغاوت کو ترجیح دی۔ اور انگریزوں سے ''نہایت وفاداری'' کا ثبوت دیتے ہوئے ترکوں کے خلاف فتوے کو بہانہ بنا کر حرمِ محترم بیت اللہ المعظم سے حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقا مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گلؒ، مولانا حکیم نصرت حسینؒ اور مولانا وحید احمدؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی اس گرفتاری کو کہا جاتا ہے کہ وہ ان رپورٹوں کا نتیجہ تھی جو خطوط حاصل ہونے کے بعد کی گئی تھیں۔ جب کہ تحریک بذاتِ خود ماہِ جون 1916ء (شعبان ۱۳۳۴ھ) میں اس وقت ختم ہو چکی تھی، جب شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اور برطانیہ کا دامن سنبھال لیا تھا۔ (113)

ادھر کابل کی حکومت سے، حکومت برطانیہ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور ان کے رفقا کے بارے میں زبردست احتجاج کیا، جس کے نتیجے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور ان کے رفقا کو ایک تنگ مکان میں بند کر دیا گیا۔ مولانا محمد میاںؒ کو کابل سے یاغستان روانہ کر دیا گیا، جہاں جا کر انھوں نے اپنا نام محمد منصور انصاریؒ رکھ لیا، جس کی وجہ سے سی آئی ڈی کو انھیں گرفتار کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب امیر امان اللہ خان کی حکومت آئی تو ان لوگوں کی رہائی اور واپسی ہوئی۔ (114)

فروری 1917ء میں حضرت شیخ الہندؒ کو جزیرہ مالٹا پہنچا دیا گیا۔ اس زمانے میں ان صبر کے پیکروں نے قوم و وطن کے لیے بڑے مصائب برداشت کیے۔ تکلیفیں اُٹھائیں، جو تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہیں۔ انہی مشقتوں کے وجہ سے شیخ الہندؒ مستقل عوارض میں مبتلا ہو گئے، جو بالآخر مرض الموت کا سبب بنے، لیکن آپ کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ مالٹا میں آپ تقریباً ساڑھے تین سال تک اسیر رہے۔ (115) اور بالآخر 15 مارچ بروز سوموار 1920ء کو مرض کی سنگینی کی بنا پر آپ کی رہائی کے احکامات جاری ہوئے تو آپ 28 جون بروز سوموار 1920ء کو ہندوستان واپس تشریف لائے۔

خلاصہ کلام:

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی جماعت کے منصوبۂ آزادی کا جائزہ لینے سے درج ذیل امور نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔

1۔ حضرت شیخ الہندؒ کا منصوبہ مکمل قومی آزادی کے لیے تھا۔ اور اس میں کسی بیرونی قوت کی قطعاً اثر انگیزی یا سازش شامل نہ تھی۔ اس دور کے تناظر میں ترکی کی خلافتِ عثمانیہ، ہندوستان کی اس مسلم حکومت کی سرپرست تصور ہوتی تھی، جس کو انگریز سامراج نے ختم کر دیا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمان اپنی سرپرست طاقت سے امداد کا بین الاقوامی قانون کے تحت استحقاق رکھتے تھے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کا

منصوبہ اسی تعاون کے ذریعے ملک کی آزادی کا تھا۔

2۔ تحریکِ شیخ الہندؒ کا مقصد انگریز سے چھٹکارے کے بعد دین کے مکمل عادلانہ نظام کا قیام تھا، جس میں روحِ عصر کے تقاضوں کا شعور شامل ہو، جو حضرت شیخ الہندؒ کے خطبات، تحریرات اور تربیت یافتہ شاگردوں کی تحریرات میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

3۔ اس دور میں مسلح جدوجہد کی حکمت عملی کا جو طریقہ کار آزادی پسند تحریکات میں موجود تھا، اس میں صرف ظالم طاقت کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اور اس کی زد کسی طور عام آدمی پر نہیں پڑتی تھی۔ جنگ آزادی میں بیسیوں مثالیں ایسی موجود ہیں کہ مجاہدین آزادی نے عام انگریز شہریوں کو تحفظ فراہم کیا۔ اور حالتِ جنگ میں ہونے کے باوجود ان سے کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ جب کہ اس کے برعکس تشدد پسند اور دہشت گرد تحریکات کی کاروائیوں کا سب سے بڑا ہدف عام شہری اور کمزور طبقہ بنتا ہے۔

www.rahimia.org

حوالہ جات وحواشی

1۔ دیکھئے! نقش حیات، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مکتبہ رشیدیہ، ساہیوال، ص:447، 448۔
2۔ دیکھئے۔ نقش حیات، ص:480۔
3۔ سفرنامہ اسیر مالٹا، مولانا حسین احمد مدنیؒ، عبیداللہ اکادمی، لاہور، س ن، ص:18۔
4۔ ایشیا کا عظیم انقلابی لیڈر، محمد سلمان منصور پوری، شاہ ولی اللہ دارالمطالعہ، بشیر بلڈنگ، لاہوری گیٹ، گوجرانوالہ، س ن، ص:3۔
5۔ دیکھئے! نقش حیات، ص:447۔
6۔ سوانح قاسمی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، 2:223۔
7۔ کہ حصول علم کا مقصد غیراللہ کی غلامی سے نجات ہے۔
8۔ تذکرہ مشائخ دیوبند، مؤلفہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مدنی دارالتالیف، بجنور، یوپی، انڈیا، 1927ء، ص:172۔
9۔ ایضاً، دیکھیے! ص: 127 تا 173۔
10۔ نقش دوام، مولانا انظر شاہ مسعودیؒ، المکتبۃ البنوریہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی، ص:205۔
11۔ گنگوہ، سہارن پور اور رائے پور۔
12۔ سونے کی لڑی۔
13۔ نقش دوام، ص:206۔
14۔ روئیداد جشن دیوبند، جانباز مرزا، مکتبہ تبصرہ 4/7 گلشن کالونی، شادباغ، لاہور، 1980ء، ص:34۔
15۔ جدوجہدِ آزادی کا رہنما ادارہ، قاری محمد طیب، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان، ص:29۔
16۔ تلوار و تیر۔
17۔ جدوجہدِ آزادی کا رہنما ادارہ، ص:4۔
18۔ ایضاً، ص:24۔
19۔ نوائے وقت لاہور، 25 مئی، بروز اتوار 1980ء۔
20۔ تذکرہ مشائخ دیوبند، ص:175۔
21۔ ایضاً، ص:214
22۔ ہفت روزہ خدام الدین، لاہور، 30 ستمبر 1988ء، مضمون: ''شیخ الہند مولانا محمود حسن''، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، ص:13۔
23۔ ایضاً۔
24۔ تذکرہ مشائخ دیوبند، ص: 217۔
25۔ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، مولانا سید محمد میاں، تدوین جدید، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، جمعیۃ پبلیکیشنز، وحدت روڈ، لاہور، 2005ء، حاشیہ: ص:133۔
26۔ ''الرشید'' دارالعلوم و دیوبند نمبر، جامعہ رشیدیہ ساہیوال، 1976ء، مضمون پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی، ص:383۔
27۔ ایضاً۔
28۔ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، مکتبہ سید احمد شہید، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور،

www.rahmia.org

2000ء، ص:223۔

29۔ نقشِ دوام، ص:205۔

30۔ دیکھیے! اسیرانِ مالٹا، ص:40 تا42۔

31۔ ید بیضاء، حامی عبیدی دین پوری، خانقاہِ دین پور، ضلع خان پور، :91، 92۔

32۔ ہفت روزہ خدام الدین، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص:15، مزید دیکھیے! علمائے حق، ص:137، 138، 139۔

33۔ 8،1907ء بلکہ 1905ء تا 1914ء کے دور کی ہنگامہ خیزی کے دو بنیادی اسباب تھے: ایک سبب 1905ء میں تقسیم صوبہ بنگال، اور دوسرا سبب پنجاب کا نوآبادیاتی بل۔ تقسیم بنگال کی وجہ سے سینکڑوں بنگالی نوجوانوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انگریز نے بہت سوں کو نہایت شدید قسم کی سزائیں دیں۔ ایک بڑی تعداد نے ملک ہی چھوڑ دیا۔ پنجاب کے نوآبادیاتی بل کے ردِعمل کے جواب میں انگریز نے بے شمار لوگوں پر بغاوت کے مقدمات چلائے۔ یوں ملک میں عام بے چینی کی فضا تھی۔ ہنگامی قوانین بنائے اور نافذ کیے گئے۔ مخالفین کی طاقت کو مضمحل کرنے اور ردِعمل کی شدت کو سست اور کمزور کرنے کے لیے انگریز نے فرقہ وارانہ فسادات بھی کروائے، جو انگریز کا پرانا آزمودہ ہتھیار ہے۔

34۔ علمائے حق، ص:138۔

35۔ ایضاً، ص:149۔

36۔ ذاتی ڈائری، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مکی دارالکتب، اردو بازار، لاہور، ص:26۔

37۔ مقدمہ قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مطبوعہ دیوبند، ص:3۔

38۔ دیکھیے! علمائے حق، ص:138، نوٹ: شیخ الہندؒ کے متعلقین کی مزید تفصیلات ملاحظہ کیجیے! نقشِ حیات، 2:597 تا 624۔

39۔ علمائے حق، ص:138۔

40۔ ایضاً، ص:138۔

41۔ ایضاً، ص:134۔

42۔ دیکھیے! نقشِ حیات، ص:561، 562، 661۔

43. التمهيد لتعريف آئمّة التجديد (عربی) مولانا عبيدالله سندھیؒ. طبع حيدر آباد، ص:26.

44۔ دیکھیے! نقشِ حیات، ص:562، ذاتی ڈائری، ص:154۔

45۔ اسیرانِ مالٹا، ص:44۔

46۔ انقلابی لیڈر، ص:9۔

47۔ ذاتی ڈائری، ص:26۔

48۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص:16۔

49۔ اسیرانِ مالٹا، ص:46۔

50۔ نقشِ حیات، ص:555، 556۔

51۔ ایضاً۔

52۔ ماہ نامہ برہان، ستمبر 1943ء، مضمون: مولانا اکبر الہٰ آبادی۔

53۔ دیکھیے! تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:106 تا 110۔

54۔ دیکھیے! تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:142۔

www.rahimia.org

55۔ تحریکِ خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی، پروگریسو بکس، 40 بی اردو بازار، ص:45۔
56۔ دیکھیے! تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:142۔
57۔ ذاتی ڈائری، ص:27۔
58۔ تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:111۔
59۔ نقش حیات، ص:632، 633۔
60۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:267۔
61۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:619۔
62۔ انقلابی لیڈر، ص:14۔
63۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:621۔
64۔ دیکھیے! مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سرگزشتِ کابل، مولانا عبداللہ لغاریؒ، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ص:10۔
65۔ نقش حیات، ص:615۔
66۔ ید بیضاء، ص:128، 129۔
67۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:616۔
68۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:616، 617۔
69۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:622۔
70۔ دیکھیے! تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:285۔
71۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:262۔
72۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:600۔
73۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:601 تا 608۔
74۔ تحریکِ خلافت، ص:47۔
75۔ سرگزشتِ کابل، ص:44۔
76۔ کابل میں سات سال، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، سندھ ساگر اکادمی، لاہور 1987ء، ص:38۔
77۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مؤلفہ مفتی عبدالخالق آزاد، مکی دارالکتب، لاہور، 1998ء، ص:29۔
78۔ ایضاً، ص:107۔
79۔ تفصیل کے لیے دیکھیے! شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، ص:106 تا 110۔
80۔ ایضاً، ص:205۔
81۔ الہام الرحمٰن، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، طبع حیدرآباد، 1:136۔
82۔ مقدمہ قواعد ومقاصد جمعیۃ الانصار، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مطبوعہ دیوبند، ص:3۔
83۔ ماہ نامہ ''القاسم'' ماہِ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ، مضمون: ''چندہ ہلالِ اَحمر اور دارالعلوم دیوبند'' از مولانا عبیداللہ سندھیؒ، طبع دیوبند۔ ص:19، 20۔
84۔ آپ بیتی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، المیزان ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، لاہور 2007ء، طبع سہارن پور، 1:318۔
85۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، ص:210، 211۔

www.rahimia.org

86۔ نقش حیات، ص:624۔
87۔ تذکرۃ الخلیل، مولانا محمد عاشق الٰہی، طبع سہارن پور، انڈیا، ص:263۔
88۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، ص:34۔
89۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:612۔
90۔ تحریکِ خلافت، ص:47،48۔
91۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:636۔
92۔ تحریک شیخ الہندؒ، ص:361،363۔
93۔ تحریکِ خلافت، ص:45۔
94۔ انقلابی لیڈر، ص:19۔
95۔ تحریکِ خلافت، ص:46۔
96۔ انقلابی لیڈر، ص:20۔
97۔ مجلّہ التوحید، تہران، نمبر 15، رجب شعبان ۱۴۰۵ھ/ 1985ء، ص:126،130۔
98۔ ماہ نامہ الفاروق، جامعہ فاروقیہ، کراچی، محرم الحرام ۱۴۲۷ھ/ فروری 2006ء، سفرنامہ، مطالعاتی دورۂ ایران (2) مولانا ولی خان المظفر، ص:39۔
99۔ بینات، کراچی، بابت ماہِ جولائی 1970ء، مضمون: پروفیسر محبوب الرحمٰن مظفرآبادی، ص:66۔
100۔ انقلابی لیڈر، ص:19،20۔
101۔ غالباً حضرت دین پوریؒ نے تحریک کا نشان یا اشارہ سمجھ لیا تھا۔
102۔ ید بیضاء، ص:142۔
103۔ الجمیعۃ سنڈے ایڈیشن، ص:58۔
104۔ دیکھیے! نقش حیات، ص:597 تا 600۔
105۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص:19،20۔
106۔ خدام الدین، حضرت لاہوری نمبر، ص:302۔
107۔ نقش حیات، ص:665۔
108۔ نقش حیات، ص:647۔
109۔ دیکھیے! تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، ادارۂ اسلامیات، کراچی، لاہور 2005ء، 2:201۔
110۔ دیکھیے! تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:140، مزید دیکھیے! تاریخ دارالعلوم دیوبند، 2:201۔
111۔ دیکھیے! تاریخ دارالعلوم دیوبند، 2:199۔
112۔ دیکھیے! تحریک شیخ الہندؒ، ص:181۔
113۔ دیکھیے! تحریکِ شیخ الہندؒ، ص:112 تا 114۔
114۔ ایضاً، ص:142۔
115۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص:18۔

www.rahimia.org

تبصرۂ کتب

نام کتاب: **اسلام میں مذہبی رواداری**
مصنف: سید صباح الدین عبدالرحمٰن
ناشر: دارالشعور، 37 مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور
قیمت: =/150 صفحات: 308
تبصرہ نگار: محمد عباس شاد
تبصرے کے لیے کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا لازمی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب پاکستان میں طبع ثانی سے آراستہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب مصنف کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1987ء میں تصنیف ہوئی ہے۔ (ص 17) اوراس کی پہلی اشاعت ہندوستان کے مشہور ادارے دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ انڈیا سے ہوئی ہے پاکستان میں دارالشعور نے یہ کتاب حال ہی میں دارالمصنفین کی اجازت سے جنوری 2010ء میں طبع کی ہے۔ یہ کتاب تتمہ سمیت تقریباً 151 عنوانات پر مشتمل اور 308 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے پاکستانی ایڈیشن میں پیش لفظ کا اضافہ ہے۔ جسے پروفیسر امجد علی شاکر نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے چار صفحات کے مختصر پیش لفظ میں چند اہم نکات اُٹھائے ہیں، جو موضوع کی گہرائی اور اہمیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ انھوں نے برصغیر میں فرقہ وارانہ علم کلام کی اس کم زوری کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں مذاہب کے درمیان مشترکہ اُصول تلاش کرنے کے بجائے مذاہب کے درمیان تضادات کو اُبھارا جاتا ہے۔ وہ اپنے پیش لفظ کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> ''اسلام نے ادیانِ سابقہ کو منسوخ کر دیا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اسلام نے ادیانِ سابقہ کی تنسیخ تکمیل کے معنوں میں کی ہے۔ تاکہ اس سے رواداری کا رویہ اور روایت آگے بڑھے۔ انگریزی عہد میں ایک نئی تعبیر بھی سامنے آئی اور ایک نیا علم کلام وجود میں آیا۔ جس کی بنیاد ادیانِ سابقہ کی کلیتاً تردید پر تھی۔ اس کے نتیجے میں تہذیبی تنہائی اور انتہا پسندی کے رویے پیدا ہوئے۔ یہ رویے تاریخ اسلام میں نو وارد بھی تھے، اجنبی بھی۔ یہ رویے ہمارے لیے مسائل اور مصائب پیدا کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ میں سفر کریں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کا تاریخ میں رویہ کیا رہا ہے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن کی کتاب ''اسلام میں مذہبی رواداری'' میں اسی رویے کی تلاش ملتی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے تاریخی طور پر کیا رویہ اپنائے رکھا۔ تردیدِ کامل کا رویہ یا تکمیل کا رویہ۔

www.rahimia.org

اختلافات کی تلاش کا رویہ یا بنیادی اُصولوں پر اتفاق اور اتحاد کا رویہ۔ یہ کتاب قرآن مجید کی اس آیت کی یاد دلاتی ہے: **تعالوا إلى كلمة سواء بيننا و بينكم ألانعبد إلا الله ولانشرک به۔**'' (ص۴)

کتاب کی وجہ تصنیف اور شانِ ورود کے حوالے سے مصنف خود رقم طراز ہیں:

''اسلام میں مذہبی رواداری کی تعلیمات کا ایک مرغ زار آباد ہے مگر قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں ان کا چمن زار نظر آئے گا، خاک سار کو اس موضوع سے بڑی دلچسپی رہی۔ 1972ء میں صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے المالطفی ہال میں ایک مقالہ ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' کے عنوان سے پڑھا تو سامعین کو اس سے بڑی دل چسپی پیدا ہوئی۔ خیال ہوا کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جائیں تو مناسب ہوگا۔ الحمدللہ کہ اس پر تین جلدیں لکھنے کی توفیق عطا ہوئی، جو دارالمصنفین سے شائع ہوگئی ہیں۔ ان کو قلم بند کرتے وقت یہ بات بھی ذہن میں آئی کے ''اسلام میں مذہبی رواداری'' کے عنوان سے بھی ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ 1976ء میں پاکستان میں سیرت نبویؐ پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تو اسی عنوان سے مجھ کو ایک مقالہ لکھنے کو کہا گیا۔ کراچی کے ایک اجلاس میں ایک مختصر مقالہ لکھ کر پیش کر دیا۔ مگر یہ خیال چھایا رہا کہ اس پر ایک مستقل کتاب ہونی چاہیے۔'' (ص7)

اسی طرح زیر تبصرہ کتاب کے مصنف کے سوانح نگار ڈاکٹر خورشید عالم لکھتے ہیں:

اس موضوع پر متفرق طور سے اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، دارالمصنفین کی کتابوں مثلاً مولانا شبلی کی تصانیف اور مقالات، سیرت النبی کی مختلف جلدوں، صحابہ کرام کے سلسلہ کی تصانیف، تاریخ اسلام، تاریخ دولت عثمانیہ، تاریخ اندلس اور تاریخ صقلیہ وغیرہ میں جابجا اس عنوان پر مباحث ہیں لیکن اس سے پہلے اس موضوع پر کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی ہے۔ اور اسلام میں مذہبی رواداری کے موضوع پر ایک مفید، بہتر اور مستند کتاب تیار ہوگئی ہے۔ (1)

لیکن ہمارے خیال میں یہ بات درست نہیں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے اردو میں کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی، بلکہ یہ شرف ندوہ ہی کے ایک فاضل حاصل کر چکے تھے۔ اور وہ تھے مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، جو اپنی وقیع تصنیف ''اسلام اور رواداری'' 1954,57ء میں پیش کر چکے ہیں۔ جو دو جلدوں میں تقریباً نوسو (900) صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب 1954ء اور 1957ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور نے شائع کی تھیں، جو شاید اب مارکیٹ میں ناپید ہے۔ رئیس احمد جعفری صاحب نے کافی محنت سے تاریخ کی کتابوں سے ڈھیر سارا مواد جمع کر دیا ہے۔ سرے دست یہ کتاب ہمارے تبصرے کا موضوع نہیں، لیکن اس کتاب کے پیش لفظ سے ہم ایک اقتباس نقل کرنا چاہیں گے۔ جس سے ہماری قدیم علمی اور قومی درس گاہوں کے بارے میں بآسانی رائے قائم کی جاسکتی

ہے، کہ وہاں کس طرح کے ذہنوں کی آب یاری ہوتی تھی۔ وہ اپنی کتاب کی پہلی جلد کے آغاز میں تقدیم کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''بہت دنوں کی بات ہے۔ میں بمبئی سے لکھنؤ جا رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں کئی ہم سفر تھے۔ سب کے سب غیر مسلم۔ میں طبعًا ذرا کم آمیز قسم کا آدمی ہوں۔ یہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اور میں خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ پہلے تو گفتگو سیاسیات پر ہوتی رہی۔ پھر مذہب پر شروع ہوئی۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اسلام کا ذکر نہ چھڑتا؟ چھڑا اور بڑی ناگواری کے ساتھ، یہ حضرات اس پر متفق ہو گئے کہ اسلام سے بڑھ کر ناروادار مذہب کوئی نہیں ہے۔ کچھ طنز، کچھ تعریض، کچھ قہقہے، یہ سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ دورانِ گفتگو میں پتہ چلتا رہا۔ کوئی وکیل ہے، کوئی بیرسٹر، کوئی جہاں گشت قسم کا تاجر۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، ایک صاحب آئی سی ایس کے اُمیدوار تھے۔ ہندوستان میں امتحان دے کر کامیاب ہو چکے تھے۔ اب عنقریب تکمیل مزید کے لیے لندن جانے والے تھے۔ انھیں اگر یہ معلوم ہوتا کہ ان کا ایک ساتھی مسلمان ہے تو شاید اسلام اور اس کے مسلک کے بارے میں محتاط الفاظ استعمال کرتے۔ آخر تہذیب اور شائستگی بھی تو کوئی چیز ہے، لیکن میں نے اس لیے انھیں معذور قرار دیا کہ ناواقف تھے؟ کچھ یہ مقصد بھی تھا کہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

سفر تو دیر میں ختم ہوا، لیکن گفتگو کا موضوع جلد ختم ہو گیا۔ میری خاموشی بدستور قائم تھی۔ فرق یہ تھا کہ اب تک میں مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اب حقائق پر غور کرنے لگا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا، کیا واقعی اسلام ناروادار ہے؟ کیا حقیقتاً مسلمان تنگ دل ہیں؟ کیا ایک مذہب جو ناروادار ہو، زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے؟ کیا ایک قوم جو تنگ دل ہو، زندہ رہ سکتی ہے؟ مجھے اپنے اسلام پر فخر تھا۔ اپنے مسلمان ہونے پر ناز تھا۔ میں نے ایک مذہبی درس گاہ .....ندوۃ العلما..... میں تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ میں ایک قومی دانش گاہ .....نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں اپنی زندگی کے کئی سال بسر کر چکا تھا۔ میں نے ''ندوہ'' میں کسی استاد سے یہ نہیں سنا کہ غیر مسلموں سے نفرت کرنی چاہیے۔ میں نے جامعہ ملیہ میں کسی اُستاذ کو غیر مسلموں کے بارے میں متعصب، ناروا اور تنگ دل نہیں پایا۔'' (2)

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ زیر تبصرہ کتاب کی اپنی تاریخی اور تصنیفی حیثیت ہے۔ اور اس نے اس موضوع پر پڑھ نے والوں کے لیے دلائل و استدلال کے نئے اسلوب نگارش کے ذریعہ تحقیق وجستجو کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ مصنف نے کتاب کے لیے مواد کی تلاش وتحقیق کے لیے جو چھان بین کی ہے، اس سے اہل علم کے دل میں ان کی علمی جستجو اور کاوش کا نقش اور گہرا ہو جاتا ہے۔ چناں چہ انہوں نے اپنی کتاب میں دار المصنفین کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے ہمہ جہت تصنیفی وتالیفی مواد سے استفادہ کیا ہے۔

چنانچہ کتاب کے مواد کی ترتیبی نوعیت پر بات کرتے ہوئے ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی ترتیبی نوعیت اس طرح ہے: پہلے قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں مذہبی رواداری کی جو تعلیمات ہیں ان کو بڑے ہی عالمانہ اور فاضلانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے جس طرح عمل کیا، اسے مستند حوالوں سے رقم کرنے کے بعد بنو امیہ، بنو عباسیہ اور دیگر مسلم فرماں رواؤں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، اور وہاں اپنی مذہبی رواداری کے جو نمونے پیش کیے ان سب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کے اصلی نمائندوں اور علم برداروں پر تعصب اور عدم رواداری کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اور چوں کہ اس طرح کے اعتراضات بالخصوص عیسائیوں کی ذہنی فتنہ جوئی کا نتیجہ ہیں، اس لیے اس کتاب کے مرتب نے اسلام اور مسلمانوں کی رواداری اور غیر مذہب والوں کے ساتھ فراخ دلی کے واقعات تحریر کرنے کے ساتھ ہی عیسائی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کی عدمِ رواداری، چیرہ دستی، سیاسی سفا کی، ظلم و بربریت اور جور و تشدد کی ہول ناک مثالیں خود عیسائی مورخین کی کتابوں سے پیش کر دی ہیں۔ اور موجودہ دور میں بھی ان کی افترا پردازی، تعصب اور فتنہ خیزی کو بے نقاب کیا ہے۔(3)

مصنف کی تحریر کا ایک جان دار پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں غیر مسلم مؤرخین کے حوالوں کو بہت وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ جو نہ صرف مصنف کی وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہے، بلکہ ایک عالم گیر انسان دوست نظریے کے ابلاغ اور فروغ میں انھوں نے بین الاقوامی سطح پر ہونے والے علمی کوششوں کا بھی احاطہ کرلیا ہے۔ مثلاً جن منصف مزاج مؤرخین کے حوالے انھوں نے اپنی کتاب میں استعمال کیے ہیں، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

ٹی ڈبلیو آرنلڈ ص10، برنارڈ لیوس ص14، جارج سیل ص18، مارگولیتھ ص18، ایچ جی ویلز ص19، اے جی گرانٹ ص94، ایس بی اسکاٹ ص133، اسٹین لین بول ص140، موسیو لیبان ص150، ڈریپر ص153، فلپ کے ہٹی 182، ایڈورڈ کریسی ص194، لارڈ ایور سلے ص195، گبن ص205، ولازن کیز 237، وان ہیمبر ص262، سر والنٹائن چیرول ص264، سر جون ص285، کے ڈی باسوج ص285، پروفیسر ڈاکٹر رام پرشاد گھوسلا ص287۔ اسی طرح سے بیسیوں حوالہ جاتی کتب کے اقتباسات زیر بحث آئے ہیں، جس سے نہ صرف غیر مسلم مفکرین کی تحریروں سے مصنف نے اپنا مقدمہ ثابت کیا ہے، بلکہ اس سے اسلام کے ہزار سالہ دورِ عروج کے عادلانہ، انسان دوست نظام کے خدوخال بھی واضح ہوتے نظر آتے ہیں۔

ہمارے ممدوح مصنف نے اپنے موضوع میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کے جابجا حوالے دیے ہیں۔ وہ ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب PREACHING OF ISLAM کے بہت مداح ہیں۔(4) ان کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں آرنلڈ کا مؤرخانہ اور مبصرانہ تجزیہ ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ عیسائی بھی اپنے تعصب کی

عینک اُتار کر اس کا مطالعہ کریں تو ان کی آنکھیں روشن، دماغ واضح اور ذہن صاف ہوجائے گا۔ (ص 10) اس کے بعد مصنف نے کچھ غیر معمولی واقعات کو آرنلڈ کی کتاب سے نقل کیا ہے، جو واقعی لائق مطالعہ ہیں، جس سے مسلمانوں کی رواداری کی گواہی ایک انصاف پسند غیر مسلم کے ہاں ملتی ہے۔ کسی غیر مسلم مصنف کی دیانت دارانہ کاوش کو تسلیم کرنا خود رواداری کی ایک اعلیٰ مثال ہے، جو آج کی شدت پسندانہ فضا میں گم ہوتی نظر آرہی ہے، کیوں کہ جب تعصب اپنی انتہا کی طرف جاتا ہے تو نہ صرف مذاہب کے درمیان رواداری مفقود ہوجاتی ہے بلکہ جانبین کے ماحول میں تناؤ اور کھچاؤ کی وجہ سے دونوں طرف بشری اور انسانی خوبیوں سے بھی اعتنا اور انکار شروع ہوجاتا ہے۔ چناں چہ امام عبیداللہ سندھیؒ، (1872ء، 1944ء) حضرت امام شاہ ولی اللہؒ (1702ء، 1763ء) کے نظریۂ اخلاق پر بات کرتے ہوئے ان کے نتائجِ فکر میں انسانیت کے اَخلاقِ اربعہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''لہٰذا اگر اہم اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نظریۂ اَخلاق میں اصولی نزاع نہ رہے گا۔ اور ہم میں فراخ دلی اور رواداری بھی پیدا ہوجائے گی۔ بے شک سماج کے جھوٹے طبقوں میں تو چپقلش موجود رہے گی، لیکن ایسے ہی جیسا کہ ایک ہی ملت کے مختلف فرقوں میں مخصوص رُجحانات اور استعدادوں کی بنا پر ذہنی اور مذہبی اختلافات ہوتے ہیں، لیکن جہاں تک اصحابِ عقل و رُشد کا تعلق ہے، ان کو آفتابِ نبوت سے پھوٹی ہوئی شعاؤں اور حکیم کے دماغ سے نکلے اَخلاقی نظام میں فرقِ مراتب تو ضرور نظر آئے گا۔ لیکن وہ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد نہ سمجھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صالح غیر مسلم اور صالح مسلمان ایک دوسرے کی خوبیوں کو بحیثیت انسان نظرِ انصاف سے جانچنے کے قابل ہوں گے۔'' (5)

اسلام کے قانونِ جنگ وصلح کے زیرِ عنوان مصنف نے فتوح البلدان کے حوالے سے سولہ اصول نقل کیے ہیں۔ (ص 89,92) جن کی بنیاد نہ صرف عدل و انصاف پر ہے بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی جنگ عقیدے کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس کی جنگ کی بنیاد ظلم کا خاتمہ اور عدل کا قیام ہے۔ اور اس کا نظامِ عدل تمام انسانیت کے لیے سایۂ رحمت ہے۔ اسلام کے قانون جنگ وصلح پر تو غیر مسلم مفکرین کی گواہی بلکہ مستقل تصنیفات تک موجود ہیں۔ چناں چہ ایک عیسائی مصنف مجید خدری نے اپنی کتاب

(war and peace in the law of islam)(6)

میں اسلام کے قانون جنگ وصلح کو بیان کرتے ہوئے غیر مسلموں کے جنگی حقوق کو تسلیم کیا ہے۔ اور اہل مغرب کی طرف سے اسلام پر اعتراضات کی تردید کی ہے۔ یہ اسلام ہی کا اعزاز ہے کہ غیر مسلم بھی اس کے قانونِ جنگ وصلح کا دفاع کر رہے ہیں۔

جزیہ جس کو بنیاد بنا کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی بلکہ بعض نادان مسلمان آج بھی قومی اور جمہوری دور میں جزیہ کو اسلام کے نظام معیشت میں ذرائع آمدن میں شمار کرتے ہیں، جس سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لے رہی ہیں۔ مصنف نے اس مسئلے کو بھی معروضی انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ص93) لیکن اس مسئلے پر تشنگی باقی رہتی ہے۔ شاید مصنف کے پیش نظر مولانا شبلی نعمانی (1857ء، 1914ء) کا وہ رسالہ ہو، جو مولانا نے اسی مسئلے کی بحث پر لکھا تھا (7) بہتر ہوتا مصنف مولانا شبلی کے رسالے سے بنیادی نکات یہاں لے آتے، جس سے اس حساس مسئلے پر قارئین کی تشنگی باقی نہ رہتی۔ بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیاتِ شبلی'' میں اس مسئلے پر قدرے روشنی ڈالی ہے۔ جسے ہم قارئین کے لیے یہاں نقل کرنا چاہیں گے:

> ''مسلمان باشاہوں کے خلاف ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی سب سے زیادہ نفرت انگیز پروپیگنڈا جزیے کے نام سے جاری کیا جاتا تھا۔ یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے، اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا۔ یعنی کوئی غیر مسلم رعایا اس مذہبی ٹیکس کے ادا کیے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ بعض فقہا نے یہی لکھا ہے کہ جزیہ غیر مسلم کو قتل نہ کیے جانے کا معاوضہ ہے، جس کو وہ ادا کرتا ہے، لیکن یہ مسلک ان مسلمان قوموں کا نہ تھا، جن کو ہندوستان کی فرماں روائی نصیب ہوئی۔ مولانا نے بڑی تحقیق سے اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچایا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے۔ یعنی اسلامی ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لیے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا۔ تاکہ مسلمان سپاہی بیرونی حملہ آوروں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کریں۔ اسی لیے جب خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں غیر مسلموں نے فوجی خدمات ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ اور مسلمانوں نے ان کی اس خدمت کو قبول کیا ہے تو وہ ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں۔'' (8)

لیکن نہ جانے مصنف نے اس مقام پر (ص93) روس کی اشتراکیت کے رد میں پورے دو صفحے کیوں لکھ دیے جو کسی بھی طرح اس بحث کے ضمن میں نہیں آتے۔ انہیں کسی بھی تحریک اور نظام فکر پر تنقید کا پورا حق حاصل ہے، لیکن موضوع کی مناسبت سے وہ دراصل مستشرقین کی طرف سے جزیہ پر بے جا الزامات کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے انھیں سرمایہ دارانہ نظامِ فکر پر روشنی ڈالنی چاہیے تھی، کیوں کہ مستشرقین نامی مخلوق نے سرمایہ داری نظام کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے، جو تشکیک کو عام کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مصنف نے ''اسلام کی لڑائیاں'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ بیسویں صدی کی متمدن دنیا نے دو عظیم جنگیں لڑیں ہیں (ص85) اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اسلام کے گلے میں جنگ اور لڑائی کا طوق ڈالنے والے اس تاریخ کو نہیں دیکھتے، جس میں تباہی اور بربادی

کی تاریخ رقم کی گئی۔ انسانوں کو مولی، گاجر کی طرح کاٹا گیا۔ اندھے، لنگڑے اور لولے انسان سسکنے کے لیے چھوڑ دیے گئے۔ جو متمدن دنیا کی بربریت کا زندہ ثبوت ہیں۔ ہارنے والی اقوام سے طاقت کے بل بوتے پر معاہدے کیے گئے، جس میں ان کے ضمیر، زبان، مذہب اور بنیادی حقوق کو پامال کیا گیا۔

مصنف موصوف نے حیرہ کی فتح کے بعد عیسائیوں سے کیے گیے معاہدہ سے مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو بھی واضح کیا ہے، جس میں ان کو حق دیا گیا تھا کہ ان کی خانقاہوں اور گرجوں کو قائم رکھا جائے گا۔ ان کے جنگی قلعوں کو نہیں گرایا جائے گا۔ ان کو ناقوس اور گھنٹے بجانے کی ممانعت نہ ہوگی۔ وہ صلیب نکال سکتے ہیں۔ گویا ان کے تمام مذہبی حقوق محفوظ ہیں آج مذہبی حوالے سے شدت پسندی خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو اور اسلامی حمیت اور غیرت کے نام پر ہو، وہ نہ تو دینی تقاضا ہے۔ اور نہ ہی اسلامی روایت۔ محض عقیدے کے اختلاف سے اسلام تہذیبی تنہائی اور معاشرتی بیگانگی کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ متنوع معاشرتی اکائیوں، مختلف مذاہب اور ہمہ نوع تہذیبوں کو ساتھ لے کر ایک عالم گیر معاشرے کے قیام کے سفر کو جاری رکھنے کا قائل ہے۔

مصنف نے ہشام بن عبدالملک کے زمانے کا واقعہ نقل کیا ہے۔ (ص 130) جس میں انھوں نے عراق کے حاکم اعلیٰ خالد بن عبداللہ قسری کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب شہنشاہ ایران نے فرقہ مانویہ کے پیشوا مانی کو قتل کروادیا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ اس فرقہ کا ایک آدمی بھی زندہ نہ بچے۔ اس وقت اس فرقے کے بے یارو مددگار پیروکاروں کو خالد بن عبداللہ حاکم عراق نے ہی پناہ دی تھی، جہاں انھوں نے امن میں رہ کر زندہ رہنے کا حق حاصل کیا تھا۔ مسلمانوں کی یہ شان آج اجنبی لگتی ہے، کیوں کہ آج یہ کردار کوئی اور ادا کر رہا ہے۔ ہم تو مخالفوں کو ملک بدر کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

اسلام کے روادارانہ تصور کو جتنا عام کرنے کی آج ضرورت ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ آج ایک سازش کے تحت مسلمان معاشروں اور دیگر انسانی برادریوں کے درمیان خلیج وسیع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس تناظر میں یہ کتاب وقت کی نہ صرف اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ دردمند مسلمانوں کو ان کا فرض بھی یاد دلاتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور آج کے نازک حالات میں اپنا کردار ادا کریں۔

کتاب کے مصنف نے اسلام کے روادارانہ تصور کے بارے میں جو اظہارِ خیال کیا ہے، وہ ان کے ذہنی، فکری اور تعلیمی ماحول کی صدائے بازگشت ہے۔ مصنف کی فکر جس فکری حلقے میں پروان چڑھی ہے، اس کے پس منظر سے آگہی ضروری ہے تاکہ ان کے نتائج فکر کے سوتوں کو جانا جا سکے۔ مصنف 1911ء کو دسنہ ضلع پٹنہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ 1928ء میں انہوں نے پٹنہ کالج سے بی اے کیا۔ موصوف 1934ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں داخل ہوئے۔ چوں کہ یہ داخلہ سید سلیمان ندوی کی سفارش سے ہوا تھا، اس لیے وہ پہلے سید صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے ''دارالمصنفین'' آئے تھے، جہاں کے ماحول میں انہیں دل کشی نظر آئی تھی۔ (9)

1935ء میں وہ سید سلیمان ندوی کے پاس چلے گئے۔ اور دارالمصنفین کے رفقا میں شامل ہو گئے۔ (10)

دارالمصنفین اعظم گڑھ مولانا شبلی کی یادگار ہے، جس کا انھوں نے 1910ء میں ندوۃ العلما کے اجلاس میں خاکہ پیش کیا تھا۔ بعد ازاں وہ ایک علمی تحریک کے طور پر اُبھرا، جس نے بہت سے صاحبِ طرز ادیب اور قلم کار پیدا کیے۔ (11) انہیں میں موصوف مصنف کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اس لیے مصنف شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور اپنے دیگر ندوی رفقائے کار سے گہرا تأثر لیے ہوئے ہیں۔ اس لیے مصنف کا فکری پس منظر مولانا شبلی نعمانی کے مکتبۂ خیال سے جڑا ہوا ہے۔ مولانا شبلیؒ بنیادی طور پر علما کے اس حلقے سے تعلق رکھتے تھے، جو مکتبی تعلیم کا دل دادہ تھا۔ لیکن تقدیرِ سرسید کے قائم کیے ہوئے ادارے میں لے آئی، جہاں سے انھوں نے جدید تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو بھی تسلیم کرنا شروع کر دیا، لیکن علی گڑھ میں سرکار پرستی، مرعوبیت، انگریز پرستی، مغربی معاشرے کی قربت، جمہوری نظام کی مخالفت اور کانگریس کی دشمنی کو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ (12) وہ سرسید کی سیاسی پالیسی کے سخت نقاد ٹھہرے۔ اور انھوں نے سرسید کی مغرب نوازی اور انگریزوں کے بارے میں نرم رویے کو مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ قرار دیا۔ (13) ان کا خیال تھا، علی گڑھ سے جو لوگ تعلیم پا کر نکل رہے ہیں، ان کی نظر سطحی ہے۔ ذہنیت غلامانہ ہے اور وہ مغربی تہذیب کے نمائندہ ہیں۔ (14)

چنانچہ مولانا شبلی نے سب سے پہلا تبصرہ علی گڑھ کے ماحول پر ان الفاظ میں کیا تھا:

''یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانے میں بی اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاحول ولا ..... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں دیکھ سکتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔ (15)

مولانا شبلی اور سرسید کے مزاج میں بنیادی طور پر جو فکری اور نظریاتی اختلاف تھا، وہ زیادہ دیر تک چھپ نہ سکا۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریزی ہو جائیں۔ اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی

یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں۔ پیچھے ہٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں'' سرسید کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستے سے پیچھے ہٹا دیں گی، جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چناں چہ اس کے خلاف انھوں نے سخت مضمون لکھا:

سیر سید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی طور وطریق اور وضع وقطع اختیار کریں، تاکہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو۔ مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اُتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا۔ دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی ہی قوم سے دور سے دور تر ہوتے گئے۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور وطریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سروسامان اتنا گراں ہوگیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے۔ اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی، وہ اس نقالی کی بدولت تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی، جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد واعانت کے قابل نہ رہے۔ اور نہ وہ ایثار کی کوئی خدمت انجام دے سکے۔ (16)

مولانا شبلی مرحوم شاید خلافت راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر یا فطرتاً جمہوریت پسند تھے۔ اور سرسید شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے۔ حال آں کہ دوسری طرف وہ اپنے کو مذہباً مسلمان اور نسلاً عرب ہونے کی بنا پر ریڈیکل کہتے تھے۔ کہیں آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس میں ایک دفعہ شخصی اور جمہوری طرز سلطنت پر مباحثہ تھا۔ مولانا نے جمہوری طرزِ سلطنت کی تائید کی اور اس پر خلفائے راشدینؓ کے واقعات اور اصولِ انتخاب سے استدلال کیا تھا۔ یہ تقریر نہایت کامیاب ہوئی اور طلبا مولانا کے زورِ بیان سے بہت متاثر ہوئے۔ حاضرین میں سرسید مرحوم بھی تھے۔ انھوں اس کی مخالفت کی۔ اور اس پر طبیعت سیر نہیں ہوئی تو مولانا کے دلائل کے رد میں ایک چھوٹا مضمون لکھا، جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے 28 جون 1892ء کے پرچے میں ''ایشیائی اور اسلامی طرزِ حکومت'' کے عنوان سے مولانا کے سفر ترکی کے لیے روانہ ہو جانے کے بعد چھپا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ تقریر اپریل 1892ء سے پہلے اسی کے کسی قریب زمانہ کی ہوگی۔ اس واقعے سے دونوں کی طبیعتوں کا سیاسی اختلاف مذاق معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے مولانا سرسید کی ان کوششوں کو، جو وہ نیشنل کانگریس کی مخالفت میں کر رہے تھے، پسند نہیں کرتے تھے۔ اور وہ دل سے کانگریس کے اصولوں کے حامی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلے میں دونوں کی راہیں بالکل الگ رہیں۔ اور اگرچہ مولانا نے کبھی سیاست کے عملی کوچے

میں قدم نہیں رکھا، مگر اخیر تک ان کی سیاسی رائے یہی رہی۔ (17)

اس تناظر میں مولانا شبلی نے ہندوستان میں قومی فکری دھارے میں اپنا وزن ڈالنا مناسب سمجھا۔ گو علی گڑھ اور دیوبند میں بنیادی اختلاف CO-OPRATIVE اور NON-CO-OPRATIVE کا تھا۔ دیوبند کی قیادت ہندوستان کی قومی آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں موجود تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان رواداری کی پرچارک تھی۔ یوں دیوبندی اسکول کے لیے شبلی کی صدا نہ اجنبی تھی اور نہ نئی، کیوں کہ وہ شبلی سے بہت پہلے کانگریس میں شرکت کا فتویٰ دے چکے تھے۔ (18) اور مسلمانوں کو اجتماعی قومی دھارے میں شرکت کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ انگریز سے سمجھوتہ اور دیوبند غیر ملکی سامراج سے آزادی کی علامت کے طور پر جانا جانے لگا۔ یہ وہ تناظر تھا، جس میں مولانا شبلی نعمانی نے اپنے جو خوشہ چین پیدا کیے۔ انھوں نے اسلام کی روادارانہ فکر کو ہندوستان کے لیے ضروری قرار دیا۔ اور ہندوستاں میں دوسرے ہم وطنوں سے مل کر جدوجہد آزادی کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن اسی قافلے کے فردِ فرید ہیں۔

مولانا شبلی اور ان کا حلقۂ فکر عملاً سیاست میں شریک نہیں رہا۔ اور علمی اور فکری سطح پر انھوں نے اس فکر پر مناسب درجے کا مواد فراہم کر دیا ہے، جو ہمارے لیے علمی رہنمائی کا کام دے رہا ہے، لیکن دیوبندی اسکول کی نمائندہ جماعت ''جمعیت علمائے ہند'' کے پلیٹ فارم سے خطبات، تقاریر اور بیانات میں اسلام کے روادارانہ تصور پر وافر مقدار میں خیالات و افکار دستیاب ہیں۔ مثلاً حضرت شیخ الہندؒ، امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سید محمد میاںؒ ایسے علما کی تحریروں میں جا بجا اسلام کے روادارانہ فکر کو پیش کیا گیا ہے۔

کیا اچھا ہوتا کہ مصنف مولانا شبلیؒ کے سکول سے باہر ان اکابرین کے اذکار کو بھی اگر حوالے کے طور پر پیش کرتے تو کتاب زیادہ جامع اور وقیع ہوتی۔

مصنف نے کتاب کے ص 35 پر ایک عنوان قائم کیا ہے: ''غزوات جارحانہ تھے یا مدافعانہ؟'' اس کے ذیل میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مدینہ کے قیام میں رسول اللہ کو ۲ھ، میں بدر اور سویق، ۳ھ میں احد، ۴ھ میں مریسیع، ۷ھ میں خیبر، ۸ھ میں موتہ، حنین اور اوطاس وغیرہ میں لڑائیاں لڑنی پڑیں، مگر یہ ساری لڑائیاں ان دشمنوں کے خلاف تھیں، جو حملہ آور ہو کر اسلام اور مسلمانوں کا استیصال چاہتے تھے۔ آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کے خلاف تلواریں اٹھیں تو اسلام کے نیام سے بھی تلواریں نکل پڑیں۔''

آگے لکھتے ہیں رسول اللہ محض مدافعانہ جنگ لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے۔ (ص 37) اسی طرح کی کئی ایک عبارات سے یہ تأثر اُبھرتا ہے کہ مصنف کے خیال میں اسلام میں جنگ کا تصور سراسر دفاعی ہے۔ ہم یہاں پر

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کی ایک عبارت سے اس مؤقف کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ یورپ نے مشرق کی عام کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پہلے تو اسلامی ملکوں میں یہ پراپیگنڈا کیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ یعنی اس میں خود عقلی اور روحانی قوت نہیں ہے۔ اس کی جواب دہی کے لیے چند عقلمند تیار ہوگئے۔ انہوں نے سمجھایا کہ اسلام ایک عقلی اور علمی مذہب ہے، مگر یورپ کے فکری حملے سے وہ بھی پورے طور پر نہ بچ سکے۔ اور ان سے بھی یہ کہلوالیا گیا کہ اسلام میں فقط مدافعانہ جنگ (Defenssive War) کی اجازت ہے ..... یورپ نے مسلمانوں سے مدافعانہ جنگ کی عذر خواہانہ دستاویز تیار کروا کے اسے خوب شہرت دی۔'' (19)

امام انقلاب کا اشارہ دراصل علی گڑھ کے اس حلقے کی طرف ہے، جس نے یورپ کے اس فکری حملے کا جواب معذرت خواہانہ دیا اور اس کو اصولی درجے میں تسلیم کرلیا کہ اسلام کی تمام جنگیں دفاعی ہیں۔ ان اعتراضات کے جواب میں سب سے پہلے سرسید مرحوم (1817ء، 1898ء) کے ایک عقیدت مند مولوی چراغ علی (1845ء، 1895ء) نے ''تحقیق الجہاد'' کے نام سے کتاب لکھی۔ (20) جس میں یہ مؤقف اختیار کیا۔ چناں چہ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''قریش نے مسلمانوں کے خلاف مدینہ میں تین جنگیں کیں۔ پہلی لڑائی جو جنگِ بدر کے نام سے موسوم ہے۔ .... دوسری لڑائی جس کو جنگ احد کہتے ہیں۔ .....تیسری جنگ احزاب تھی۔ آں حضرت اور قریش کے مابین صرف یہی تین لڑائیاں ہوئیں۔ اور ہر ایک لڑائی میں آں حضرت نے مدافعت کی۔ ..... آں حضرت کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔'' (21)

اور خصوصیت کے ساتھ جنگ بدر پر مستشرقین کے اس اعتراض کے تناظر میں کہ حضور نے اپنے صحابہ کو ساتھ لے کر قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ معذرت خواہانہ طرزِ استدلال رکھنے والا طبقہ بڑے شدومد کے ساتھ اس کو دفاعی غزوہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چناں چہ مولوی چراغ علی مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ یہ جنگ (بدر) محض دفاعی تھی۔ اور اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں۔'' (ص6)

اسی پس منظر میں مولانا شبلی نعمانی (1857ء، 1914ء) نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''سیرۃ النبی'' میں (22) کئی صفحات پر پھیلی بحث میں اپنا سارا زورِ قلم اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کردیا ہے کہ غزوۂ بدر دفاعی غزوہ تھا۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلے میں عام مؤرخین اور اربابِ سیرت میرے حریف، مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پاسکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کے لیے سب سے پہلے ہم کو بتادینا چاہیے کہ ہماری تحقیقات کی رو سے واقعے کی اصلی

صورت کیا تھی۔(ص۱۶۳)

معروف ولی اللّٰہی عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (1991ء، 1962ء) نے مولانا شبلی کے نقطہ نظر کو جمہور کے مسلمات کے خلاف قرار دیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''غزوۂ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علمائے اسلام کے نزدیک مسلم ہیں۔ خصوصاً اس مسئلے میں تو سلف خلف میں سے کسی کی بھی دو رائے نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلے پر حملہ مقصود تھا، لیکن وادیٔ ذفران میں پہنچ کر قدرتی حادثے نے ایک دوسرے مقابلے سے دوچار کردیا۔ اور مشرکین مکہ کی وہ یورش تھی، جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ظہور میں آئی۔ اور اب مسلمانوں کو عیر ونفیر دو کے ساتھ واسطہ پڑ گیا ....مگر جمہور کے ان مسلمات کے خلاف مولانا شبلی مرحوم ومغفور نے ''سیرۃ النبی'' جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف ''نفیر'' کے لیے نکلے تھے۔ اور خدا کے وعدہ ''عیر ونفیر'' کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ ....مولانا مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے طویل بحث فرمائی ہے۔ اور احادیث وسیر میں مذکور واقعات کی ترتیب کا اس لیے انکار کردیا ہے کہ وہ اس ترتیب کو قرآن کی تصریحات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہ بعض صحیح احادیث وروایات بھی ان کے خیال کی ہی تائید کرتی ہیں۔ چوں کہ یہ مسئلہ علمی نظر وفکر سے تعلق رکھتا ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ قرآن عزیز ہی کی روشنی میں مناظرانہ اسلوب سے بچ کر خالص تحقیقی رنگ میں اس پر ''محاکمہ'' کیا جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہوسکے۔(23)

جو حضرات مزید تفصیلات پڑھنا چاہیں، وہ دونوں بزرگوں کی تصنیفات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ میرا مقصود صرف اتنا ہے کہ ان تفصیلات سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ دراصل ہمارے مصنف اسلام کے جنگی نقطہ نظر میں اپنے فکری حلقے کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے جو مؤقف مستشرقین کے دفاع میں سرسید مرحوم اور مولوی چراغ علی مرحوم نے اپنایا تھا۔ بعد ازاں شبلی مرحوم اس پر نئے دلائل تلاش کرتے رہے۔ اسی نقطۂ خیال کی خوشہ چینی ہمارے مصنف نے کی ہے۔ اور ہم تفصیل سے اپنے مصنف کا ذہنی اور فکری پس منظر پیش کر چکے ہیں، لیکن مصنف نے اپنی کتاب کے ص86 پر یورپ کی جارحانہ جنگوں پر تنقید کرتے ہوئے، اس حقیقت کا بھی اظہار کردیا ہے کہ اگر اسلام نے حق وصداقت کی ترویج کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کیا تو اس پر شرمانے کی ضرورت بھی نہیں۔

تاہم اس مسئلے پر امام سندھیؒ کا مؤقف بہت ہی حقیقت پسندانہ ہے، جس میں نہ تو یورپ کے فکری حملوں سے مرعوبیت پائی جاتی ہے۔ اور نہ ہی وہ مولانا مودودی مرحوم (1903ء، 1979ء) کی طرح اسلام کی شدت پسندانہ اور جارحانہ تعبیر کے قائل ہیں۔ بلکہ وہ اسلام کی ظلم کے خلاف مزاحمتی فکر اور انقلابی روح کو برقرار رکھتے ہوئے دشمن کے خلاف اقدام کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ چناں چہ وہ اسلام کو ایک انقلابی تحریک قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

www.rahimia.org

''انقلابی لوگ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ سوسائٹی کو رجعت پسندوں سے بھی پاک کریں وہ اس کا انتظار نہیں کر سکتے کہ رجعت پسند ان پر حملہ کریں۔ تبھی ان کے حملہ آور ہونے کا جواب دیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر رجعت پسندوں پر حملہ کر کے ان کی حملہ آور ہونے کی طاقت چھین لینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً سورہ فتح میں جس میں کل قومی جنگوں کی طرف اشارہ ہے صلح حدیبیہ کے بعد ہی خیبر پر حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دے دیا گیا ہے۔ کیا وہ جنگ مدافعانہ تھی؟ تاریخ کا فیصلہ اس کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی تحریک ارتقائی نہیں انقلابی تحریک ہے۔'' (24)

بہرحال مجموعی طور پر مصنف کی اس کاوش پر ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے اسلام کے رواداررانہ تصور پر وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے قلم اٹھایا۔ اور اس کا حق ادا کیا۔ کیوں کہ آج اسلام کے عالم گیر معاشرے کا خواب اسی صورت پورا ہوسکتا ہے کہ مسلمان دنیا میں موجود صالح افراد کو اپنا ہم نوا بنائیں۔ نہ یہ کہ ہر عقیدے کے مخالف کو دشمن تصور کرلیا جائے۔ ہمارے مصنف یورپین مصنفین کی اہم تصنیفات سے مسلمانوں کی رواداری کی شان دار مثالیں پیش کرتے ہیں، جو ایک بے داغ گواہی ہے۔ جسے آج کے دور میں منظر عام پر لانا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک چھوٹے سے طبقے کی نااہلی اور جہالت کی وجہ سے پوری دنیا کی اسلامی برادری کو نشانے پر رکھ لیا گیا ہے۔ آج کا دور، جس میں کسی بھی فکر کو ناپنے کا اصلی پیمانہ اس کا سماجی فکر اور معاشی تعلیمات ہیں۔ ایسے میں مصنف کا ایسے اقتباسات حوالوں کے طور پر پیش کرنا، جس میں اسلام کی سماجی و معاشی تعلیمات کے ذریعے اس کے عدل و انصاف کے پہلو کو اُجاگر کرنا، روحِ عصر کے بنیادی سوالات کا جواب ہے۔ چناں چہ ہمارے مصنف ایک اور معروف یورپین مؤرخ ایچ جی ویلز کا حوالہ دیتے ہیں کہ:

''ایچ جی ویلز (25) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر ہے، لیکن اسلام کی ترقی کا تجزیہ کرنے میں اس کو بھی لکھنا پڑا کہ: ''یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تعلیمات ہیں۔ جب اس کی تبلیغ شروع ہوئی تو معاشرے میں ظلم وستم کا دور دورہ تھا، جس سے سوسائٹی دب کر رہ گئی تھی۔ اسلام نے ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کیا، جس سے معاشرتی ستم آرائی ختم ہوگئی۔'' (ص19)

ہمارے مصنف نے ایک دقیق النظر نقاد، منصف مزاج مؤرخ اور ایک کامیاب محقق کی طرح اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی رواداری کو ثابت کرنے میں جو تاریخی اصول اور طرزِ استدلال اختیار کیا ہے۔ اور عیسائیوں کی عدمِ رواداری اور سفاکی کے جو ثبوت پیش کیے ہیں۔ اس سے پوری کتاب میں کہیں بھی بے جا حمایت یا عداوت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ انہوں نے دل کو پاسبانِ عقل بنا کر نہایت مدلل گفتگو کی ہے۔ اور مستند و معتبر حوالوں سے دلیل کو محکم بنایا ہے۔ ورنہ آج کے دور میں مذہبی تعصب اور نسلی جانب داری سے بچنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف۔

کیوں کہ عام طور پر جو تاریخی مواد ہمارے سامنے آرہا ہے، وہ جانب داری سے خالی نہیں ہے۔ گو یہ کتاب تاریخ کے موضوع پر نہیں ہے، لیکن یہ اپنے بنیادی تصورات کے باعث تاریخ کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ اس میں سے اگر تاریخ کو نکال دیا جائے تو کتاب اپنا مفہوم کھو دے گی۔ مصنف نے دینی تصورات کے ساتھ تاریخ کے بھی بنیادی اصولوں کو سامنے رکھا ہے۔ خصوصاً مولانا شبلی جس طرح سے تاریخ کے بارے میں خیال کرتے تھے کہ: ''تاریخ وہ ہے جس میں تمدن، معاشرت، اخلاق، مذہب، الغرض ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔'' (26) کا مصنف نے خصوصی طور پر خیال رکھا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا علما، طلبا اور مبلغین کے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ وہ تشدد، فرقہ واریت اور نظریاتی کنفیوژن کے دور میں اسلام کی سچی تصویر پیش کرسکیں۔

www.rahimia.org

حوالہ جات

1۔ خورشید عالم، ڈاکٹر۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن حیات اور کارنامے۔ ص238۔ لکھنؤ: احسان بک ڈپو۔ 2009ء۔

2۔ جعفری، رئیس احمد۔ اسلام اور رواداری، جلد اول۔ ص17۔ لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ 1959ء۔

3۔ خورشید عالم، ڈاکٹر۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن حیات اور کارنامے۔ ص238۔ لکھنؤ: احسان بک ڈپو۔ 2009ء۔

4۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے کیا ہے، جس کی پہلی اشاعت حیدرآباد دکن سے، جب کہ دوسری اشاعت 1972ء میں شعبہ مطبوعات علما اکیڈمی، لاہور سے ہوئی۔ اب تیسری اشاعت ادارہ تخلیقات لاہور سے ہوئی ہے۔

5۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا۔ شعور و آگہی۔ ص19۔ لاہور۔ عزیز پبلی کیشنز۔ 1986ء۔

6۔ یہ کتاب 1959ء میں مکتبہ معین ادب لاہور سے مولانا غلام رسول مہر کے ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

7۔ مولانا شبلی کا یہ رسالہ بعنوان ''الجزیہ'' کی میرے پیش نظر اشاعت جس کے کل 8 صفحات ہیں۔ ان کی کتاب المامون کے ساتھ ہی بطورِ ضمیمہ شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجران کتب، کشمیری بازار، لاہور، طبع 1940ء ہے۔ تاہم یہ ان کے مقالات میں بھی شامل ہے۔

8۔ ندوی، سلیمان، سید۔ حیاتِ شبلی۔ ص17۔ اعظم گڑھ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی۔ اکتوبر 2008ء۔

9۔ خورشید عالم، ڈاکٹر۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن حیات اور کارنامے۔ ص 17، 28، 29۔ لکھنؤ: احسان بک ڈپو۔ 2009ء۔

10۔ سہ ماہی فکر و نظر۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نمبر۔ ص15۔ اسلام آباد۔ جنوری تا مارچ 1988ء۔

11۔ خورشید، نعمانی، پروفیسر۔ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، جلد اول۔ ص28، 29، 30۔ اعظم گڑھ: دارالمصنفین، 2003ء۔

12۔ شاہد ماہلی۔ مولانا شبلی کی سیاسی بصیرت/شبلی کی علمی ادبی خدمات۔ خلیق انجم۔ ص182۔ نئی دلی: انجمن ترقی اردو۔ 1996ء۔

13۔ انصاری، ضیاؤ الدین، ڈاکٹر۔ علامہ شبلی کے سیاسی افکار/شبلی کی علمی ادبی خدمات۔ خلیق انجم۔ ص157۔ ایضاً۔

14۔ مہدی، صغرا، پروفیسر۔ شبلی اور سرسید/شبلی کی علمی ادبی خدمات۔ خلیق انجم۔ ص44۔ ایضاً۔

15۔ ندوی، سلیمان، سید۔ حیاتِ شبلی۔ ص131۔ اعظم گڑھ، انڈیا۔ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔ اکتوبر 2008ء۔

16۔ ندوی، سلیمان، سید حیاتِ شبلی۔ ص241۔ اعظم گڑھ، انڈیا۔ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔ اکتوبر 2008ء۔

17۔ ندوی، سلیمان، سید۔ حیات شبلی۔ ص244۔ اعظم گڑھ، انڈیا۔ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔ اکتوبر 2008ء۔

18۔ نصرۃ الابرار۔ ص19۔ لاہور: مکتبہ صحافی۔

19۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا۔ قرآنی شعورِ انقلاب۔ ص424۔ لاہور: مکی دارالکتب۔ اکتوبر 2002ء۔

20۔ اصل کتاب انگریزی میں تھی، جس کا نام Critical Exposition Of The Popular Jihad ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ''تحقیق الجہاد'' کے نام سے مولوی غلام حسنین اور مولوی عبدالغفور نے کیا تھا۔

21۔ نواب اعظم یار جنگ، چراغ علی، مولوی۔ تحقیق الجہاد مع ضمیمہ جات۔ ص7,2۔ لاہور: مکتبہ اخوت۔ طبع جدید اگست 2003ء۔

22۔ نعمانی، شبلی مولانا۔ سیرۃ النبی۔ ص163 تا 172۔ لاہور: البرہان پبلی کیشنز، اکتوبر 2006ء۔

23۔ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، مولانا۔ قصص القرآن، جلد چہارم۔ ص403,402۔ دہلی: ندوۃ المصنفین۔ 1994ء۔

24۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا۔ قرآنی شعورِ انقلاب۔ ص420,21۔ لاہور: مکی دارالکتب۔ اکتوبر 2002ء۔

25۔ ایچ جی ویلز (1866,1946ء) کی معروف کتاب AShort history of the world ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ''مختصر تاریخ عالم'' کے نام سے جنوری 1996ء میں ادارہ تخلیقات، لاہور نے شائع کیا ہے۔

26۔ بھٹی، عبدالجلیل، پروفیسر۔ شبلی کا نظریۂ تاریخ۔ ص82 تا 84۔ بہاولپور: ادارۂ تواریخ۔ 1989ء۔

www.taemeernews.com

آرا و تأثرات

مکتوبِ گرامی

دانش گاہِ علیمی، 28-R، سیکٹر 15/A
بفرزون، نارتھ ناظم آباد ٹاؤن، کراچی
محترم جناب حضرت مفتی عبدالخالق آزاد صاحب مدیر اعلیٰ سہ ماہی ''شعور وآگہی'' لاہور

ہدیۂ تہنیت

عصرِ حاضر میں اسلامی فکر وعمل کے ''فلسفہ ولی اللّٰہی'' کے داعیِ اکبر اور قطبِ عالم حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ العزیز کے خلیفہ مجاز نیز قطب الارشاد شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کے وارث و جانشین، شیخ الطریقت وشریعت اور اسلامی سیاست کے رہبر و رہنما، محبی ومشفقی، سیدی وسندی، مرشدی ومولائی حضرتِ اقدس شاہ سعید احمد رائے پوری، متع اللہ المسلمین بفیوضہ ابداً نے اپنے کراچی کے حالیہ سفر کے موقع پر ۱۸/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ بمطابق 5 مارچ 2010ء کو ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کراچی شاخ میں مجلس ذکر و نمازِ عشا کے بعد سہ ماہی مجلّہ ''شعور وآگہی'' بنفسِ نفیس بقلمِ خود کلماتِ خیر لکھ کر اس بندۂ ناچیز، حقیر وفقیر، عاجز و عاصی، معذور ومہجور کو عنایت فرمایا۔ جو اس بے علم وعمل کے لیے یقیناً بڑی سعادت کی بات ہے۔

سلسلۂ رائے پور کے مشائخ کرام سے راقم کے بزرگ ہمیشہ وابستہ رہے۔ ہمارے بزرگ قطبِ عالم حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ العزیز اور ان کے خلیفہ مجاز اور جانشین، قطب الارشاد شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کی صحبتِ قدسی صفات سے ہمیشہ بہرہ ور رہے۔ عمِ محترم پروفیسر محمد عبدالمغنی (مترجم امداد السلوک)، تایا محترم محقق العصر، امام فنِ اسماء الرجال، شیخ الحدیث علامہ محمد عبدالرشید نعمانی (صاحبِ لغات القرآن)، والدِ ماجد شیخ الجلیل وفاضل النبیل، حضرت مولانا ابوالعلاء محمد عبدالعلیم ندوی (صاحب القوی المتین) قدّس اللّٰہ أسرارھم و دیگر احبابِ خاندان کا تعلق خانقاہ رائے پور کے ان مشائخ سے رہا ہے۔ اوّل الذکر پروفیسر موصوف وثانی الذکر محقق العصر نعمانی رحمہم اللہ تو قطبِ عالم حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے مجاز تھے۔

جب کہ والدِ ماجد حضرت مولانا عبدالعلیم ندوی سلسلۂ ولی اللہی کے بزرگوں سے بہت تھوڑے واسطوں کے ساتھ مجازِ بیعت تھے۔ چناں چہ انھیں حضرت مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ شیخ الحدیث ومہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اجازت حاصل کی۔ اور وہ سید الطائفہ شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ تھانوی ثم مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ

مجاز تھے۔ اسی طرح والد گرامی حضرت شاہ فضل اللہ الصمد الگیلانی (سابق ڈین دینیات، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن) کے مجازِ بیعت تھے۔ ان کو اپنے دادا (مولانا محمد علی مونگیری) بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے خلافت ملی تھی۔ اور ان کو شیخ الطریقت حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی نوراللہ مرقدہ سے خلافت حاصل تھی۔ اور ان کو شیخ المشائخ و محدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نوراللہ مرقدہ سے اجازت تھی۔ اور ان کو اپنے والدِ گرامی قدر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے اجازت حاصل تھی۔ لیکن ولی اللّٰہی سلسلے کے مشائخ سے اس قدر قوی صحبت اور قلیل الوسائط ہونے کے باوجود والدِ محترم نے قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوری قدس سرہٗ سے شرفِ بیعت حاصل کیا تھا۔ اور تادمِ مرگ ان سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تمام بھائی بہن اس روحانی سلسلے کے متوسلین و متبعین میں سے ہیں۔

راقم السطور پر تو حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم کی ہمیشہ سے نظرِ عنایت رہی ہے۔ اور اس زمانے سے آپ کی شفقت مجھ پر رہی۔ جب کہ ناچیز اس ادراک سے ہی ناواقف تھا کہ مشائخِ کرام کے علمی و روحانی فیوض و برکات کے کیا ثمرات ہوتے ہیں۔ غالباً 1970ء سے ہی یہ احقر الناس، مرشدِ پاک سے قریب تر رہا اور باوجود میری نالائقیوں اور بحث و مباحثے کے دوران کسی حد تک گستاخیوں پر حضرت شیخ نے ہمیشہ صرفِ نظر سے کام لیا اور عفو و درگزر۔ دراصل یہی بزرگوں کی شان ہوتی ہے۔ اور سنتِ نبوی ﷺ کے عین مطابق بھی ہے۔

1988ء میں جب موجودہ حضرت اقدس رائے پوری خانقاہ رحیمیہ رائے پور کے مسند نشین مقرر ہونے کے بعد پہلی مرتبہ کراچی تشریف لائے تو میرے بچے حضرت اقدس کے استقبال کے لیے کراچی کینٹ گئے۔ میں نے انھیں تنبیہ کردی کہ اب حضرتِ اقدس وہ نہیں رہے، جن سے تم فری ہوکر باتیں کرتے تھے۔ اب حضرت کی مصروفیات و مشاغل اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ کیوں کہ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند مقام و مرتبے پر فائز ہیں۔ اس کے پیشِ نظر معتقدین کا حق زیادہ بنتا ہے۔ چناں چہ اس موقع پر دیکھا گیا کہ ریلوے اسٹیشن کراچی کے پلیٹ فارم پر علمائے کرام و مشائخ عظام کا ایک جمِ غفیر موجود ہے، جن میں خاک سار کے محبّ و مشفق، عزیز و رفیق ڈاکٹر حبیب اللہ مختار (شہید) رحمہ اللہ، مہتمم جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی اور حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمہ اللہ اور دیگر اساتذہ استقبال کے لیے موجود ہیں۔ مشائخ خانقاہِ رائے پور کے بارے میں مخدومی و معظمی فضیلۃ الشیخ مفتی عبدالخالق آزاد کیا خوب فرماتے ہیں: تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''بلاشبہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے فیضِ قدسی صفات سے فیض یاب ہونے والے ان مشائخ نے موجودہ دور میں شعبۂ طریقت و سلوک کے بنیادی اصول، شرائط اور طریقۂ کار واضح کر کے اپنے متوسلین اور متبعین کے لیے ایک ایسی وسیع شاہ راہِ فکر و عمل مقرر کردی ہے، جس پر چل کر

وابستگانِ سلسلہ وصول الی اللہ کے حصول میں کامیاب ہوئے۔

آپ کے تمام جانشین کرام نے پورے تسلسل کے ساتھ اس فکر وعمل کے مطابق کام کیا۔ خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے مشائخ قطبِ عالم حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، قطبِ عالم حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری قدس اللہ اسرارہم نے اپنے اپنے ادوار میں اسی فکر وعمل کو بنیاد بنایا اور انسانی قلوب کو فیض یاب کیا۔ اور نفوسِ انسانی کے زنگ کو دور کیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ان حضرات کے جانشین اور خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے موجودہ مسند نشین حضرتِ اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدفیوضہم آج بھی مخلصین ومحبین کے دلوں کے زنگ کو دور کر رہے ہیں۔ اور قلوب کو واصل الی اللہ بنانے میں مصروفِ عمل ہیں۔ رجوع الی اللہ کے اس بنیادی نظریہ وشعور کو باہمت دلوں میں پیوست کر رہے ہیں۔'' (مشائخ رائے پور)

مجلّہ سہ ماہی ''شعور وآگہی'' لاہور، اسلامی فکر وعمل کے ''نظریۂ ولی اللّٰہی'' کے داعیِ اکبر حضرتِ شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی کی زیرِ سرپرستی شروع کیا گیا ہے۔ اور محقق جلیل مفتی عبدالخالق آزاد زید مجدہ کے زیرِ ادارت علما وفضلا، خاص طور پر نوجوان انگریزداں طبقے کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد نوجوانوں کے لیے شعور وآگہی کے وہ ابواب رقم کرنا ہے، جو اسلاف کا وطیرہ رہا ہے۔ مغربی تہذیب کے دل دادہ اور دورِ جدید کے ملحدین ومکذبین کے افکار ونظریات، الیکٹرانک وپرنٹ میڈیا کی وساطت سے، حتیٰ کہ ایس ایم ایس کے ذریعے ہماری نوجوان نسل کو دینی فکر وشعور سے بے بہرہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جیسا کہ ہر دور میں دشمنانِ اسلام کا مشن رہا ہے۔ لمحہ فکر یہ ہے کہ دورِ جدید کے استحصالی نظریات اور ان پر مبنی ظالمانہ نظام کے اثرات نوجوانوں پر عفریت کی طرح چھا گئے ہیں۔ اور ظلم وستم کے اثرات مکمل طور پر غالب ہیں۔ اور ہمارے نوجوان اس سے مغلوب ہو چکے ہیں۔

ایسے حالات میں ہمارے شیخ محترم ومعظم حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ نے اس بگاڑ کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ وہ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ قوم کی اس بے راہ روی پر مضطرب وبے چین نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے اسلاف کے بیان کردہ دینی عقل وشعور پر مبنی اصول وقوانین وضوابط کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل کے لیے جدوجہد اور کوشش کر رہے ہیں۔ ولی اللّٰہی علوم وافکار کی شمع اُٹھائے اس پیرانہ سالی میں بھی، جب کہ آپ کی عمر 85 سال کی ہو چکی ہے، ہمہ تن مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ دور دراز کا سفر کرتے ہیں۔ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر شہر، سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے متعلقین اور نوجوان احباب تک پہنچتے ہیں۔ اور نہ صرف پاکستان، بلکہ ہندوستان میں خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور میں جا کر بھی لوگوں کے قلوب واذہان میں جذبۂ صادقہ پیدا کرتے ہیں۔ عدل وانصاف کا نظریہ اور اس کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ دین اسلام کی تعلیمات کی اساس پر ایک انسان دوست معاشرے کی تشکیل کرنے کی جدوجہد میں سرگرمِ عمل ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ملت کے انفرادی واجتماعی حالات میں انقلاب پیدا کرنے کی

www.rahimia.org

جدوجہد میں مصروف ہیں۔ نیز بداَخلاقی اور بری عادات سے نجات کے لیے اللہ رب جلیل کی بارگاہِ صمدیت میں عجز و انکساری اور خلوص سے دعاؤں میں مشغول رہتے ہیں۔

شیخ مکرم و معظم کا یہ طریق احسن رہا ہے کہ نوجوانوں کو وعیدیں سنا کر نہیں، بلکہ نویدوں اور بشارتوں سے ان کے قلوب و اذہان میں دین سے محبت پیدا فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طبقۂ فکر ونظر کا نوجوان حضرت کی شفقت و محبت اور نظریات و خیالات سے متأثر نظر آتا ہے۔ چناں چہ اب تک سینکڑوں قلوب آپ کے فیوضِ قدسی صفات سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ اس طرح اَغیار کے نظریات و خیالات کی جگہ ان کے قلوب و اذہان میں ذکر وفکر اور عقل و شعور کے ایسے چراغ روشن ہوگئے ہیں کہ چراغ سے چراغ جلے جا رہے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس فیض کو تادیر جاری رکھے اور من حیث المجموع ہمیں اس سے مستفید فرمائے۔ آمین

خاکسار کو رسالہ ''شعور و آگہی'' کے مطالعے کی توفیق ملی۔ پڑھ کر یقین ہوگیا کہ اس مجلّے کو پڑھنے والے حضرات انشاء اللہ تعالیٰ ضرور اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں گے اور کام یاب ہوں گے۔

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد مدفیوضہم کی مخلصانہ کاوش، مضامین کی اثر آفرینی، فکر وعمل کی تحریک اور اسلامی تعلیمات کی برکات اور بہترین انتخاب کے پیش نظر انشاءاللہ تعالیٰ یہ عجالۂ نافعہ اُمت کی رہنمائی میں بہترین کردار ادا کرے گا۔ اور انسانوں کی کام یابی کا قابلِ اعتماد ذریعہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مدیر اعلیٰ اور معاونین کو جزائے خیر دے اور مجلّے کا فائدہ عام و تام بنادے۔ آمین

احقر الناس
پروفیسر محمد عبدالودود علیمی
7 مارچ 2010ء

Former Director & Sr. Faculty Co-ordinator
ADBP College Agri. Dev.Bank of Pakistan Karachi

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) کی ترقیات

الحمدللہ! ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ مسند نشین خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کی زیرِ سرپرستی گزشتہ دس سال سے نوجوانوں میں قرآنی علوم کے فروغ اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ادارے کا مین کیمپس لاہور میں واقع ہے۔ جس میں تعلیم و تربیت، تزکیۂ و تصفیۂ قلب اور سیاسی شعور و آگہی کا کام بڑی جامعیت کے ساتھ سرانجام دیا جا رہا ہے۔

کچھ عرصے سے اس بات کی ضرورت تھی کہ ملک کے دیگر اہم شہروں میں بھی ادارے کے ریجنل کیمپس قائم کیے جائیں۔ تاکہ ہر بڑے شہر کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ زیادہ عمدگی کے ساتھ سرانجام دیا جاسکے۔ چناں چہ ادارے کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق کراچی، سکھر اور ملتان میں ادارے کے ریجنل کیمپس قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ احباب کے تعاون سے گزشتہ چند مہینوں میں ان شہروں میں ذیلی کیمپس قائم ہو چکے ہیں۔ اور ان میں مجالس ہائے ذکر، درسِ قرآن، دینی موضوعات پر سیمینارز کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

ان ریجنل کیمپسز کا افتتاح ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کے سرپرست حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ، ادارے کی مجلس شوریٰ کے اراکین کی معیت میں فرما چکے ہیں۔ چناں چہ مؤرخہ 24 فروری 2010ء، بروز بدھ کو ریجنل کیمپس کراچی کا افتتاح کیا گیا۔ اور مؤرخہ 8 مارچ 2010ء، بروز سوموار کو ریجنل کیمپس سکھر کا افتتاح کیا گیا۔ اسی طرح 25 اپریل 2010ء، بروز اتوار کو ریجنل کیمپس ملتان کا افتتاح کیا گیا۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ نوجوانوں، پروفیسرز، ڈاکٹرز اور علمائے کرام نے شرکت کی۔ اور ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کے تعلیم اور تربیتی کاموں سے آگاہی حاصل کی۔

چناں چہ اب ملک میں ادارہ رحیمیہ کے درجِ ذیل ریجنل کیمپس کام کر رہے ہیں:

ہیڈ آفس و مین کیمپس لاہور: رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

فون نمبر: 0092-42-36307714/36369089

ریجنل کیمپس کراچی: رحیمیہ ہاؤس 9/A، سینٹر پوائنٹ سوسائٹی، بلاک نمبر 21، راشد منہاس روڈ، فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون نمبر: 0092-21-36321616 , 36320707

ریجنل کیمپس سکھر: فلیٹ نمبر 111، 1st فلور، رائل اپارٹمنٹ، ریس کورس روڈ، سکھر۔ 0092-71-5615185

ریجنل کیمپس ملتان: رحیمیہ ہاؤس 30/A، سٹریٹ نمبر 2، خان کالونی، چونگی نمبر 7، ایل ایم کیو روڈ، ملتان

فون نمبر: 0092-61-6212021

www.rahimia.org

اسلام کا روادارانہ فکر

مولانا شبلی نے ہندوستان میں قومی فکری دھارے میں اپنا وزن ڈالنا مناسب سمجھا۔ گو علی گڑھ اور دیوبند میں بنیادی اختلاف CO-OPRATIVE اور NON-CO-OPRATIVE کا تھا۔ دیوبند کی قیادت ہندوستان کی قومی آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں موجود تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان رواداری کی پرچارک تھی۔ یوں دیوبندی اسکول کے لیے شبلی کی صدا نہ اجنبی تھی اور نہ نئی، کیوں کہ وہ شبلی سے بہت پہلے کانگریس میں شرکت کا فتویٰ دے چکے تھے۔ اور مسلمانوں کو اجتماعی قومی دھارے میں شرکت کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ انگریز سے سمجھوتہ اور دیوبند غیر ملکی سامراج سے آزادی کی علامت کے طور پر جانا جانے لگا۔ یہ وہ تناظر تھا، جس میں مولانا شبلی نعمانی نے اپنے جو خوشہ چین پیدا کیے۔ انھوں نے اسلام کی روادارانہ فکر کو ہندوستان کے لیے ضروری قرار دیا۔ اور ہندوستاں میں دوسرے ہم وطنوں سے مل کر جدوجہد آزادی کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن اسی قافلے کے فردِ فرید ہیں۔

مولانا شبلی اور ان کا حلقۂ فکر عملاً سیاست میں شریک نہیں رہا۔ اور علمی اور فکری سطح پر انھوں نے اس فکر پر مناسب درجے کا مواد فراہم کر دیا ہے، جو ہمارے لیے علمی رہنمائی کا کام دے رہا ہے، لیکن دیوبندی اسکول کی نمائندہ جماعت ''جمعیت علمائے ہند'' کے پلیٹ فارم سے خطبات، تقاریر اور بیانات میں اسلام کے روادارانہ تصور پر وافر مقدار میں خیالات و افکار دستیاب ہیں۔ مثلاً حضرت شیخ الہندؒ، امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سید محمد میاںؒ ایسے علما کی تحریروں میں جا بجا اسلام کے روادارانہ فکر کو پیش کیا گیا ہے۔

(کتاب ''اسلام میں مذہبی رواداری'' پر تبصرہ، ص110)

www.rahnuma.org

QUARTERLY

Shauor o Aaghi

Lahore

APRIL- JUNE 2010 Issue # 2 Vol.# 2 Regd.# 370-S

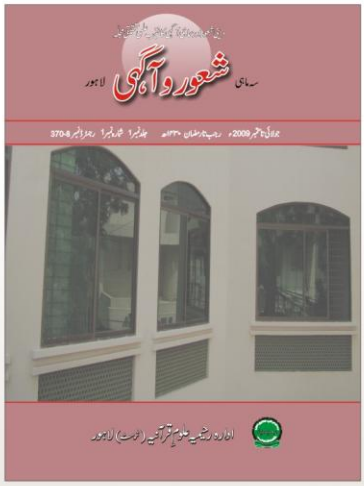

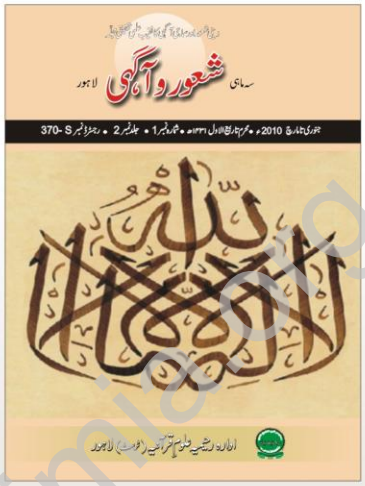

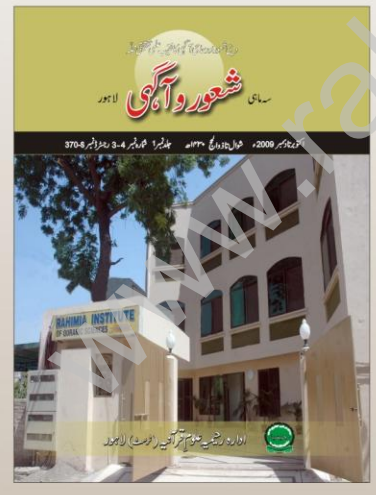

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ، شاہراہِ فاطمہ جناح، لاہور